بیراگ
(ناول)
مارٹن وکرماسنگھے
ترجمہ: مصطفیٰ نذیر احمد

مارٹن وکرماسنگھے

ترجمہ: مصطفیٰ نذیر احمد

مشعل

آر۔ بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600' پاکستان

پیش لفظ

اس ناول کا پس منظر سری لنکا کا دیہی علاقہ ہے جس سے مارٹن وکرماسنگھے بخوبی واقف تھے اور اس ناول کے دلچسپ ہونے کی وجہ دیہی سنہالی ثقافت کی حقیقت پسندانہ پیشکش ہے۔

ناول ''بیراگی'' 1957ء میں جب منظر عام پر آیا تو مارٹن وکرماسنگھے پہلے ہی سنہالی ادب میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ بطور ادیب ان کا کیریئر چالیس برس پہلے شروع ہوا تھا اور وہ فکشن اور تنقید کی پچیس سے زیادہ کتابیں لکھ چکے تھے۔ ''بیراگی'' کی اشاعت سے پہلے وہ اپنے ناول ''گم پرالیا'' کی وجہ سے جانے جاتے تھے جو ہے تو ایک خاندان کے نشیب وفراز کی کہانی لیکن درحقیقت سنہالی معاشرے میں تبدیلی کے عمل کا جائزہ پیش کرتی ہے۔ یہ تبدیلی ان جدید قوتوں، جن میں سے چند جزیرے پر مغربی اثر کا نتیجہ تھیں، کی وجہ سے آئی جن کا سامنا روایتی طریقوں اور اقدار کو کرنا پڑا۔

مارٹن وکرماسنگھے ادبی مباحثوں میں شرکت کے شوقین اور بظاہر ان سے مثبت انداز میں لطف اندوز ہوتے تھے۔ اپنے آخری ناول ''بواتر رانیا'' کی اشاعت پر انہیں شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ناول مہاتما بدھ کی زندگی کے تاریخی وتنقیدی جائزے پر مبنی تھا۔ ان کی حقیقت پسندانہ پیشکش اور صورتحال کے تاریخی روایتی چھان بین نے ان لوگوں کو خوفزدہ کر دیا جو مہاتما بدھ کے روایتی تصور سے آگے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

مارٹن وکرماسنگھے کا انتقال 1976ء میں چھیاسی برس کی عمر میں ہوا۔

اختتامیہ

سری داس جیا سنا اور میں اس زمانے سے دوست تھے جب ہم اکٹھے سکول جایا کرتے تھے۔ سروجنی کے ساتھ اس کی شادی ہماری دوستی پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس آخری مرتبہ ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ پہلے گیا تھا۔

سری داس نے اپنی شادی کے فوراً بعد اپنے لیے ایک نیا گھر بنا لیا تھا لیکن جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تھا تو اس نے اپنے نئے گھر کے لیے کرائے دار ڈھونڈ لیا اور دوبارہ اپنے آبائی گھر میں آباد ہوگیا۔ اگرچہ تین ایکڑ رقبے پر کھڑی اس کی عمارت اتنی بڑی نہیں تھی جتنی عموماً ایسی عمارتیں ہوا کرتی ہیں لیکن وہ اپنی موٹی دیواروں اور ستونوں اور جسیم کھڑکیوں، چوکھٹوں اور شہتیروں کے ساتھ بڑی پائیداری اور پختگی کا تاثر دیتی تھی۔ مکان کی تعمیر میں استعمال ہونے والی شاندار لکڑی اسے بنانے والے (سری داس کے والد جو گاؤں کے بڑے بوڑھوں میں سے تھے) کی دماغی مضبوطی اور طاقت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

''سامی ہمارا خیال تھا تم ہمیں بھول چکے ہو!'' سری داس چلایا۔ میرا استقبال کرتے ہوئے وہ جگمگا رہا تھا۔ ''تم ابا کے جنازے کے بعد صرف ایک مرتبہ یہاں آئے ہو۔'' اس نے میرے گرد ہاتھ ڈالتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''ہم تم سے ملنے کے لیے ترس رہے تھے۔'' اس کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اروندا جیا سنا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

''میں گزشتہ ایک سال سے ہندوستان میں آوارہ گردی کر رہا تھا۔''

''پھر تو تم نے تمام مقدس مقامات پر عبادت کی ہوگی۔''

''سب پر تو نہیں لیکن میں کچھ جگہوں پر ضرور گیا تھا۔'' میں نے اپنے لیے ایک آرام دہ کرسی منتخب کی۔

''یقیناً اس میں پورا سال نہیں لگا ہوگا؟''

''نہیں نہیں۔ اس میں تو تین مہینے بھی نہیں لگے۔ باقی وقت میں نے ہندوستان میں سیر کرتے ہوئے گزارا۔ اس دوران میں یوگیوں،سنیاسیوں اور ایسے لوگوں سے ملا جنہوں نے مخفی علوم کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ میں نے ان سے گھنٹوں بات چیت کی۔ اس کے علاوہ میں نے جوتشیوں کو تلاش کیا اور انہیں اپنا زائچہ دکھایا۔ دست شناسوں نے مجھے میرے مستقبل کے متعلق بتایا۔''

سری داس نے میری گفتگو ایسے سنی جیسے کوئی بچہ پریوں کی حیرت انگیز کہانی سن رہا ہو۔ مجھے پتا چل گیا کہ وہ مجھ سے بہت سے سوالات پوچھے گا۔ وہ جادو، کالے علم اور مخفی علوم پر پختہ یقین رکھتا تھا۔

مجھے یاد ہے وہ بچپن میں بھی دوسرے بچوں سے خاصا مختلف تھا۔ اسے کھیل پسند تھے اور اس کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ بھی کھیل جاری رکھتا۔ گو عموماً وہی جیتتا لیکن اس میں شکست کو خوشدلی سے تسلیم کرنے کا حوصلہ تھا اور اگلے دن وہ ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ کھیل کے میدان میں موجود ہوتا۔

لیکن وہ اپنی حرکتوں کے بارے میں بات چیت کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ بعض اوقات جب ہم تین دوست اکٹھے ہوتے تو اپنی کسی شرارت کی شیخیاں بگھارنا شروع کر دیتے۔

''میں ایک دن اپنی والدہ سے اتنا ناراض ہوا کہ میں نے انہیں واقعی ڈانٹ دیا......''

''میں نے ایک لڑکی کا بوسہ لیا!......''

''میں نے اپنے والد کی جیب سے دس روپے نکالے اور ان کی مٹھائی خرید لی۔''

سری داس سنتا اور مسکراتا لیکن اپنے متعلق کبھی بات نہ کرتا حتیٰ کہ ہم اس کو طعنہ بھی دیتے۔ وہ صرف تب گفتگو میں شریک ہوتا جب موضوع کھیل یا ہمارے دوست ہوتے۔ جب ہم خواتین یا لڑکیوں یا محبت کے بارے میں اس انداز میں کھلم کھلا بات چیت کرتے جیسے ان چیزوں کے متعلق سب کچھ جانتے ہوں تو وہ فوراً اپنے خول میں چلا جاتا۔

''ہندوستان میں مَیں نے صرف مخفی علوم کا مطالعہ کیا، ان کی مشق کرنی نہیں سیکھی۔'' میں نے سری داس کے سوالوں کے جواب میں کہا۔ ''میرے خیال میں ہندوستان کے مخفی علوم جاننے والے ہمارے سری لنکا والوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں اور ان کے جوتشی تو بالکل ہمارے جیسے ہیں۔ شاید ان میں سے کچھ کو زیادہ سنسکرت آتی ہے۔ ہندوستان میں وہ قیافہ شناسی بظاہر زیادہ بہتر سمجھتے ہیں یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہم سے زیادہ ہنرمند ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے انہیں کسی شخص کے کردار کا صرف دیکھ کر خود بخود پتا چل جاتا ہے۔ دو نے تو صرف مجھے دیکھ کر میری ہتھیلی دیکھنے سے صاف انکار کر دیا۔''

''کیوں؟''

''مجھے دیکھ کر انہیں یقین احساس ہو گیا ہو گا کہ مجھے اس قسم کی چیزوں پر زیادہ یقین نہیں ہے۔ درحقیقت ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو کسی بھی چیز پر یقین نہیں رکھتا۔''

''لیکن سامی، کیا تم دست شناسی اور ایسی چیزوں پر یقین نہیں رکھتے؟ غالباً انہوں نے اس لیے انکار کیا ہو گا کیونکہ تم بے موقع گئے ہو گے۔''

''یہ عین ممکن ہے لیکن مجھے ایسا لگا جیسے انہیں مجھ پر شک ہو۔''

ہم نے دوسری چیزوں کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ میری وجہ سے اس کی اپنے کچھ رشتے داروں کے ساتھ ناچاقی ہو گئی ہے۔ ''وہ سب معاملات اب ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔'' اس نے کہا۔ اس نے غیر ارادی طور پر کچھ ایسی باتیں کیں جن سے مجھے ایسا لگا کہ ان پر اس کا اندھا اعتماد متزلزل ہو چکا ہے۔

''اور تمہارے چچا کا بیٹا اروندا جیاسنا آج کل کہاں ہے؟''

''اسے وفات پائے آج پورے چار مہینے ہو گئے۔'' سری داس نے افسردگی سے جواب دیا۔ اس کی بیوی نے بے چینی سے نیچے دیکھا جیسے اپنے چہرے کا تاثر چھپانا چاہتی ہو۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے سوال نے کسی ایسی کیفیت کو جنم دے دیا ہے جو حزن و ملال سے زیادہ ہے۔ وہ شرمندہ نظر آ رہے تھے۔

اروندا جیاسنا کی وفات کا سن کر مجھے بہت رنج ہوا کیونکہ درحقیقت میں اس کے بارے میں معلوم کرنے کی امید لیے ہی سری داس سے ملنے آیا تھا۔ اروندا براہ راست میرے ہندوستان جانے کے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہوا تھا لیکن مخفی علوم سے میری دلچسپی ہی میں ہر چیز پر اس سے مفصل بحث کروں گا۔

میرا تعلق عالموں، پنڈتوں، ادیبوں، دانشوروں، ماہر مابعد الطبیعیات، نجومیوں، عاملوں اور سادھو سنتوں سے رہا ہے۔ بہر حال میں کبھی صحیح طور پر اروندا جیاسنا کی شناخت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے اس کے ساتھ گفتگو اور بحث کرتے ہوئے گھنٹوں گزارے تھے۔ اس سب کے باوجود میں خود کو اسکی شخصیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کا اہل نہیں سمجھتا۔ بعض اوقات وہ کسی دانشور کی طرح بحث کرتا جبکہ دوسرے موقعوں پر وہ خاصے نامعقول خیالات کا اظہار کرتا۔ اس کے علاوہ وہ حد درجہ نابالغ اور جذباتی محرکات کا غلام بھی لگتا۔

مجھے ایسا لگتا کہ اروندا کی عجیب و غریب اور پیچیدہ شخصیت میں کوئی واحد خصوصیت نہیں ہے جسے واضح طور پر پہچانا جا سکے۔ میں نے سیکھا کہ انسانی شخصیت کو تشکیل دینے والی خصوصیات میں امتیاز کرنا کتنا مشکل ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے دھنک کے رنگوں کو علیحدہ علیحدہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اروندا کو سمجھنا کسی سراب کے پیچھے بھاگنے کے مانند تھا۔ ایسے موقعے بھی آئے جب مجھے یوں لگا جیسے اس کا دماغ اوٹ پٹانگ باتوں سے بھری ہوئی ردی کی ٹوکری سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اور پھر دوبارہ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ اس کا دل بہت سی قابل تعریف خوبیوں کا مجموعہ ہے۔

اروندا اور سری داس دونوں ہی بہت نرم دل اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ لیکن اروندا میں مجھے بعض اوقات چھپی ہوئی عجیب و غریب خوبیاں نظر آتیں، جیسے کسی

تاریک غار کی گہرائیوں میں چنگاریاں سلگ رہی ہوں، اور میں سوچتا ہوں کہ کہیں یہ غیر معمولی طور پر تشکیل شدہ شخصیت کی علامتیں تو نہیں ہیں۔ وہ اتنا کچھ جانتا تھا جو صرف عقلمندانہ اور منطقی تحقیق ہی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ تمام شعور اور منطق کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پوری طرح بکواس پر بھی یقین رکھتا تھا۔ اسے مطالعے کا جنون تھا۔ ایک ایسا وقت بھی تھا جب اس نے بدھ مت کی مابعد الطبیعیات کا بے تکان مطالعہ کیا۔ ایک اور موقعے پر وہ کیمیادان بنا۔ لیکن اروندا جس چیز کا مطالعہ کرتا اس میں اس قدر سادہ لوح بننے کی اہلیت تھی کہ کوئی دیہاتی بھی شرما جاتا۔

شاید سچائی صرف نہ تھی کہ اس کے جذبات اس کی عقل سے زیادہ بڑے اور شدید تھے۔ وہ کبھی غصے یا غم کا اظہار نہ کرتا۔ نہ ہی اس نے کبھی ہمدردی، نیکی یا محبت کو لفظوں میں بیان کیا۔ اسے باقی لوگوں جتنا ہی غصہ آتا ہوگا لیکن جیسے ہی اسے غصہ آتا وہ اسے رحم میں تبدیل کر دیتا۔ میرے خیال میں جو شخص محبت اور نفرت کو اس طرح اپنے اندر گھونٹنے کی کوشش کرتا ہے اسے یقیناً بہت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اروندا کو کبھی کسی عورت کے لیے محبت یا غصہ یا پھر کسی بھی قسم کی نفسانی خواہشات کا اظہار کیے بغیر زندہ رہنے کے لیے یقیناً اپنے آپ سے بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں گی۔ میں اروندا کی غیر معمولی شخصیت کے متعلق مزید جاننے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

''اس کی موت بہت غم انگیز تھی، بالکل اس کی زندگی کی طرح!'' سری داس دوبارہ بولا۔

''اس کا انتقال کہاں ہوا؟''

''وہ اپنی لے پالک بیٹی کے مکان میں فوت ہوا۔ گو وہ بہت ہی بدکردار عورت ہے مگر اس نے اروندا کی دیکھ بھال اپنے سگے باپ سے بھی زیادہ کی۔''

''یہ وہی دہرا رہے ہیں جو مینکا کہتی ہے۔'' سری داس کی بیوی نے غصے سے اس کی بات کاٹی۔ ''باٹھی بدکردار عورت نہیں ہے۔ اروندا واحد شخص ہے جو یہ بات جانتا تھا۔ سری داس بجائے خود سوچنے کے مینکا کی کہی ہوئی ہر بات مان لیتے ہیں۔''

''اروندا احمق تھا۔'' سری داس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''اور اگر وہ احمق نہیں

تھا تو خوابوں کی دنیا کا باسی تھا۔ کیا یہ اس کی بیوقوفی کی وجہ سے نہیں تھا کہ اسے اتنی تضحیک اور ذلت سہنی پڑی؟ صرف اس چھچھوری عورت کی وجہ سے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اروندا برا آدمی تھا۔ وہ بہترین آدمی تھا۔ لیکن زیادہ اچھا ہونا بھی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک نے اسے بیوقوف بنایا۔''

''آپ تو خود عورتوں کے ہاتھوں آسانی سے بیوقوف بن جاتے ہیں۔'' اس کی بیوی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں مینکا کو کوئی بیوقوف نہیں بنا سکتا۔'' میں نے رائے دی۔

''بالکل درست۔'' سری داس کی بیوی نے میری تائید کی۔ ''اور نہ ہی وہ کسی سے ڈرتی ہے۔''

''جنازے کے بعد باتھی چاہتی تھی کہ مینکا اروندا کی کتابیں اور دوسرا مال اسباب لے جائے۔ مینکا نے کہا وہ انہیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گی۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ باتھی سے بہت ناراض تھی۔ بعد میں وہ میرے پاس آئی اور سرگوشی کی کہ ان چیزوں کو لے جاؤ اور محفوظ رکھو۔''

''اب وہ کہاں ہیں؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں نے اروندا کی سب چیزوں کو اس والے کمرے کے کونے میں رکھ دیا ہے۔'' سری داس نے برآمدے کے اختتام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کچھ کتابیں ہیں اور باقی دوسری چیزیں۔ کچھ کتابیں اس کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔'' وہ ایسے بتا رہا تھا جیسے کسی گندگی کے ڈھیر کا ذکر کر رہا ہو۔

میں اپنی بے قراری کو بمشکل چھپا سکتا تھا۔ شاید اسی گندگی کے ڈھیر میں وہ موتی چھپے تھے جنہیں میں تلاش کر رہا تھا!

''سری داس، کیا تم نے وہ کتابیں پڑھی ہیں؟''

''ہاں، میں نے اروندا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک کتاب کا مطالعہ ضرور کیا ہے۔ بس ادھر ادھر سے کچھ صفحے پڑھے تھے۔ وہ اس کی آپ بیتی ہے۔ میں نے جو تھوڑا بہت پڑھا وہ اتنا تکلیف دہ تھا کہ آگے نہیں پڑھ سکا۔''

''آپ بیتی!؟''میں نادانستہ طور پر اچھل پڑا۔ سری داس کی بیوی مجھے گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رشک اور تشویش تھی۔

''تم نے مجھے کبھی اس کے متعلق نہیں بتایا۔'' اس نے قدرے غصے سے کہا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ وہ اروندا کی آپ بیتی پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔

''میں اسے پڑھ کر تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔''میں نے مکاری سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ وہ بے چینی سے مسکرائی اور اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

''اگر اس نے سری داس کو اتنا پریشان کیا ہے تو مینکا اسے پڑھ کر ہزار گنا زیادہ برا محسوس کرے گی۔'' اس نے کہا۔

''اگر مینکا کو ان باتوں کا ذرا بھی اندازہ ہوتا جو اروندا نے لکھی ہیں تو اس نے کتابیں جلا دی ہوتیں اور راکھ دریا میں بہادی ہوتی۔'' سری داس نے کہا۔

''میری خواہش ہے کہ میں وہ مینکا کو دے دوں۔'' اس کی بیوی نے کہا۔

کتنی خوش قسمتی تھی کہ اس نے پہلے اروندا کی آپ بیتی کے متعلق نہیں سنا تھا! اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو وہ اسے فوراً مینکا کے پاس لے گئی ہوتی۔

مجھے سری داس سے معلوم ہوا کہ اروندا کے رشتے دار اس کے جنازے پر آنے والے لوگوں کی تعداد دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ جنازے کی آخری رسم اس کے اپنے گاؤں میں ہی ادا کی گئی تھی اور دیہاتی غول در غول اپنی عقیدت کا اظہار کرنے آئے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ آیا ان سادہ لوح، ان پڑھ، قدامت پسند اور افواہیں پھیلانے والے دیہاتیوں کے پاس حقیقی اچھائی کو پہچاننے کی کوئی جبلی سمجھ بوجھ ہے؟

''جب وہ بیمار تھا تو میں اس کے پاس زیادہ نہیں جاتا تھا کیوں کہ بظاہر مجھے دیکھ کر اس کی تکلیف میں اضافہ ہو جاتا۔'' سری داس نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے باہر لے آیا، شاید اس گفتگو کو ختم کرنے کے لیے جو اسے بہت ہی تکلیف دہ محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کمرے میں اروندا کی کتابیں پڑھتے ہوئے رات گزارنا سب سے بہتر ہوگا۔

''اندر چلے جاؤ سامی۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور میں اندر چلا آیا۔

میرے نتھنوں تک مندروں اور بھوت پریت اتارنے کی رسموں کی مخصوص لوبان کی بو پہنچی۔ اس بو اور مٹی کی مہک کے ساتھ جڑی بوٹیوں کی ایسی باس رچی ہوئی تھی جیسی کہ خانقاہوں کے کتب خانوں سے آتی ہے۔ جونہی سری داس نے کھڑکیاں کھولیں شام کی روشنی ان میں سے اندر آ گئی جس نے کمرے کے اندھیرے کونوں کو روشن کر دیا۔ تازہ ہوا نے کمرے کی فضا کی گھٹن کو کم کر دیا اور میں بہتر محسوس کرنے لگا۔ ایک مکڑی بڑے سے جالے پر دوڑی جو شہتیروں سے لے کر کتابوں سے بھری ہوئی الماری کے اوپر تک پھیلا ہوا تھا اور چھت کے کونے میں غائب ہو گئی۔

الماری میں انگریزی، سنسکرت اور پالی کی کتابیں بیکار پڑی تھیں۔ ان میں سے کچھ کی جلد چمڑے کی تھی اور کچھ کی کپڑے کی اور وہ اس حیران کر دینے والے عالم کی توجہ سے محروم تھیں جس نے انہیں اتنی مرتبہ استعمال کیا تھا۔ جیسے جیسے میں نے کیمیا، بدھ مت کی مابعد الطبیعیات، مخفی علوم، جادو اور دماغی تحقیق پر کتابوں کے سرورق پڑھے مجھے لگا کہ اروندا کے ذہن کے بارے میں میری ابتدائی رائے زیادہ غلط نہیں تھی۔ ایک چھوٹی سی میز پر مہاتما بدھ کی کانسی کی مورتی پڑی تھی۔ اس کے قریب بھوج پتر پر لکھے ہوئے مسودات کا ڈھیر تھا۔ میں نے ان میں سے ایک کو اٹھایا اور اسے پڑھنے کی کوشش کی۔ بظاہر یہ اس قسم کے جادو اور مخفی عملیات کے متعلق تھا جنہیں مہاتما بدھ نے بے معنی علم قرار دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مورتی بھوج پتر پر لکھے ہوئے مسودات اور کتابوں کی نگران ہو لیکن اسے واضح طور پر سری داس نے وہاں رکھا تھا۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اروندا نے کیمیا گری کے تجربے کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ایک چھوٹی میز پر ننھا سا ترازو، محدب عدسہ، بہت سی شیشے کی نلکیاں اور کچھ دوسرے آلات پڑے تھے۔ کمرہ کیا تھا سچ مچ کا عجائب گھر تھا۔ وہ مردہ اروندا کی داخلی زندگی کی یادگار لگتا تھا۔

سری داس نے ایک چھوٹا سا بنڈل اٹھایا جو ایک کونے میں پڑا تھا۔

''یہ ایک ٹین کے اندر تھا جس پر تانبے کی مہر لگی ہوئی تھی۔ یہ بیخ ایرسا، ہینگ اور ہلدی کے ملغوبے میں مضبوطی سے جما ہوا تھا اور مختلف قسم کے پتوں میں لپٹا ہوا تھا۔'' سری

داس نے بنڈل سے ایک چھوٹا سا ڈھیلا، جس پر کالی، پیلی اور نقرئی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں، نکالتے ہوئے کہا۔

''یہ یقیناً کیمیا گری کے ذریعے سونا بنانے کی کوشش کا نتیجہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔
سری داس اس ڈھیلے کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے اروندا کی آپ بیتی اٹھالی۔

''اروندا نے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ باتھی نے سنا کہ وہ بہت بیمار ہے تو وہ اسے اپنے گھر لے گئی۔ تب تک ہمیں احساس نہیں تھا کہ وہ کتنا بیمار ہے۔'' سری داس نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔'' باتھی نے اس کی تیمارداری کی اور اتنا خیال رکھا جتنا شاید ہم بھی نہ رکھ پاتے۔''

اس کے اعتراف نے مجھے حیران نہیں کیا۔ اروندا کے متعلق اپنے تمام سوالوں کے جوابوں سے میں کچھ سمجھ چکا تھا کہ وہ اروندا کی بیماری کے دوران اس سے اپنی لاتعلقی کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''سامی۔'' اس کی بیوی نے سیدھا میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' سری داس اروندا کی بیماری کے دوران ایک مرتبہ بھی اس کے پاس نہیں گیا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر اروندا سے ملنے سے پہلو تہی کی کہ وہ وسوسوں کا شکار ہے۔ نہ ہی مینکا کبھی اس سے ملنے گئی۔ یہ دونوں اس سے ناراض تھے۔''

اس نے اپنی انگلیاں صاف کیں اور باورچی خانے سے جنگلی سیبوں کی کریم کی ایک پلیٹ لے آئی۔ ملازم لڑکا تین صاف پلیٹیں لے آیا اور اس نے میٹھے کے لیے وہ ہمارے سامنے لگا دیں۔

جیسے ہی ہم کھانا ختم کر کے اٹھے ملازم برتن باورچی خانے میں لے گیا۔ میری میزبان نے میز پوش پر سے بچے کھچے ٹکڑے ایک گندی پلیٹ میں جمع کیے۔

باہر اندھیرا خاصا گہرا ہو گیا تھا۔ اچانک کھڑکی کے راستے ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور سارے گھر میں پھر گیا جس سے لیمپ جھولنے لگا۔ ہلکی ہلکی بونداباندی ہو رہی تھی۔ بارش پردوں سے ٹکرا رہی تھی اور گھر کے اندر پھوار آ رہی تھی۔ سری داس نے اٹھ کر

کھڑکی بند کر دی۔

میں نے قریب چار گھنٹے بعد اروندا کی آپ بیتی پڑھتے پڑھتے نیچے رکھی۔ جیسے ہی میں نے لیمپ بجھایا اور خود کو سونے کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی اس وقت گھڑی نے تین بجائے۔

کمرے کی تاریکی اور بھاری سکوت غور وفکر کرنے کے لیے موزوں تھا، نیند کے لیے نہیں۔ بارش بند ہوگئی تھی اور سکوت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اپنے خیالوں کو کھلا چھوڑ دیا تو میں ساری رات سو نہ سکوں گا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک لڑکی کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا جسے میں بہت پہلے سکول میں جانتا تھا۔ اس کا نام رنجنی تھا۔ خوش کن خیالات نے میرے دماغ کو لوری دینا شروع کر دی۔ جب میں جاگا تو دن چڑھے بہت دیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

سری داس اور اس کی بیوی دونوں ہی اب زندہ نہیں ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی وجیرہ نے ایک تاجر کے بیٹے سے شادی کی جو سنگاپور میں اچھا کاروبار کر رہا ہے اور وہیں آباد ہو گئی ہے۔

میں اروندا کی آپ بیتی پڑھنے کے بعد بھی اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکا۔

میں نے مزید دوبارہ پڑھا ہے اور اس کی ترتیب ٹھیک کی ہے۔ میں نے بہت زیادہ تبدیلیاں کرنے سے احتراز کیا ہے۔ میرے خیال میں ابتدائی جملے اور آخری ایک یا دو بات دوبارہ سے لکھے جانے کی ضرورت تھی اور میں نے پہلے تین باب بھی دوبارہ سے ترتیب دیئے ہیں تا کہ کہانی قدرتی طور پر نشو ونما پا سکے۔

اب میں آئندہ ابواب میں اروندا جیاسنا کی آپ بیتی پیش کرتا ہوں۔ وہ کس قسم کا آدمی تھا؟ اگر آپ اسے پڑھنے کے بعد اس سوال کا جواب دے سکیں تو آپ کو یقیناً انسانی شخصیت کی گہری سمجھ ہے اور خود زندگی کی بھی۔

میں سمجھا کرتا تھا کہ مجھے انسانی روح کی چھپی ہوئی گہرائیوں کا علم ہے۔ لیکن

صرف اروندا کی کہانی پڑھ کر مجھے ان نا معلوم اور نا قابل تصور خیالات، احساسات اور محرکات (ان میں سے زیادہ تر ایک دوسرے کے متضاد ہیں) کی صحیح سوجھ بوجھ ہوئی جن سے انفرادی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔

اروندا اپنے والدین اور بہن سے شدید محبت کرتا تھا پھر بھی اس نے ان کی اچھائیاں اور برائیاں ایک سے انداز میں کھلم کھلا بیان کی ہیں۔ حتیٰ کہ اس نے روح کے چھپے گوشوں میں مخفی حد درجہ کے ناخوشگوار محرکات بھی افشا کر دیے ہیں جیسے وہ اعتراف کی مافوق الفطرت پاکیزہ کر دینے والی قوتوں پر یقین رکھتا ہو۔

یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اروندا فطری طور پر پارسائی حتیٰ کہ بزرگی کی طرف مائل تھا۔ یوں تو وہ تمام عمر عام آدمی رہا لیکن اس کی کہانی مجھے ان سنیاسیوں کی منظّم روحانیت کی یاد دلاتی ہے جنہوں نے ''تھیراگاتھا'' جیسی کہانیاں لکھیں یا اس سنیاسی کی یاد جو بعض اوقات اپنی گزشتہ زندگی کے گناہوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔

اسے شخصیت اور ذہن کے خفیہ کونوں میں دھنس جانے والی بصیرت حاصل تھی۔ اس کے باوجود دنیا اور زندگی کے متعلق اس کا رویہ کئی طریقوں سے واضح طور پر سیدھا سادہ تھا۔ حتیٰ کہ ان چیزوں میں بھی جنہیں عقل کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے وہ مخفی علوم کی نیم روشن دنیا تلاش کرتا تھا۔

پہلا باب

ملک کے جس حصے میں ہم رہتے تھے وہاں ابا کی بحیثیت طبیب بہت شہرت تھی۔ دیہاتی ان کی تعریف میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اور جب وہ ان سے ملاقات کے لیے آتے تو اکثر تحفے لے کر آتے۔ لیکن ابا عام طور پر لوگوں کی موجودگی میں کم گوئی کا مظاہرہ کرتے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ ان دنوں وہ کیسے تھے تو (میرے انگلش سینئر امتحانات پاس کرنے کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا) مجھے احساس ہوتا کہ میں نے شاید ہی انہیں کبھی مسکراتے دیکھا ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے لیے یہ ماننا مشکل ہوگا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ابا بعض اوقات خاصے پر سکون بھی ہوتے ہوں لیکن ایسا میری غیر حاضری ہی میں ہوا ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کسی ایسے شخص کے خیالات اور احساسات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے جو اتنا کم گو اور سنجیدہ ہو۔

یقیناً مجھے ابا کی کہی اور کی ہوئی کچھ باتیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن وہ اکثر اوقات ایسی حرکتیں کرتے جنہیں میں اب بھی خاصا عجیب وغریب سمجھتا ہوں۔ خریداری کرتے وقت ابا بے تکان بحث کرتے۔ وہ تین روپے کی چیز کا مول ایک روپیہ لگاتے۔ اگر یہ پیشکش قبول نہ کی جاتی تو وہ اس شخص کے پاس دوبارہ جانے کی بجائے کسی اور جگہ پر تین حتیٰ کہ ساڑھے تین روپے ادا کر دیتے۔ میں نے انہیں کچھ چیزیں پچیس روپے کی خریدتے بھی دیکھا ہے جبکہ انہیں ایک اور جگہ کا بھی معلوم تھا جہاں سے وہ بیس روپے کی مل سکتی تھیں۔ ابا نے کوئی چیز سو روپے کی خریدی ہوتی اور اماں اس کی قیمت پوچھتیں تو وہ اس کی قیمت نوے روپے بتاتے۔ اگر وہ کہتیں بہت سستی ہے تو وہ خوش ہو جاتے لیکن

اگر وہ کہتیں بہت مہنگی ہے تو ابا کہتے کہ وہ انھوں نے دراصل سو روپے میں خریدی ہے اور اماں کا مذاق اڑاتے۔

اگر کوئی مزدور یا گاڑی بان شکایت کرتا کہ انھوں نے اسے پورے پیسے نہیں دیے تو وہ اس سے گرما گرم بحث کرتے۔ وہ شخص صحیح رقم لے کر چلا جاتا تو ابا اسے جاتے ہوئے دیکھتے اور گالی دیتے۔لیکن اگر کوئی گاڑی بان کچھ کہے بغیر وہ رقم قبول کر لیتا جو اسے دی جاتی تو ابا اسے واپس بلاتے اور دس پچیس حتیٰ کہ پچاس روپے بخشیش بھی دے دیتے۔

بعض اوقات جب اماں نے کسی فقیر کو دو روپے دیے ہوتے تو ابا اس شخص کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے اور انہیں جھڑکتے: ''یہ شخص بدمعاش ہے۔تم نے اپنی رقم ایک بدمعاش پر ضائع کی ہے۔'' لیکن کچھ اور موقعوں پر وہ کسی ایسے فقیر کو دس روپے بھی دے دیتے جسے اماں نے دھتکار دیا ہوتا۔بعض اوقات انہیں کسی شخص کی شکل پسند آجاتی اور وہ اس پر ترس کھاتے اور اگر انہیں کسی شخص کی شکل پسند نہ آتی تو وہ اس پر ترس نہ کھاتے تھے۔ میرے خیال میں وہ کلی طور پر پہلے تاثر پر ہی انحصار کرتے تھے۔تاہم یہ پوری طرح درست نہیں ہے کیونکہ ان کی تمام حرکتوں کی توضیح اس طریقے سے مکمل نہیں ہے۔

جب کوئی رشتہ دار مدد مانگنے کے لیے آتا تو وہ پہلے اس کی خوب درگت بناتے اور جب اسے اچھی طرح لتاڑ چکتے تو گھر میں موجود تمام رقم بھی اسے دینے سے دریغ نہ کرتے۔

ابا کو تحفے لینا پسند نہیں تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی تحفہ قبول کرتے انہیں اس کے لیے دو تین بار مجبور کرنا پڑتا تھا۔وہ اس لیے ایسا نہیں کرتے تھے کہ اس طرح انہیں کسی فائدے کی توقع تھی یا پھر تحفہ قبول کرنے کا روایتی طریقہ ہی یہی تھا۔ وہ حقیقتاً دولت سے متنفر تھے۔''تمہارا تحفہ میرے کس کام کا؟ اسے لے جاؤ!'' وہ کسانوں سے کہتے۔کبھی کبھی ان میں سے کوئی ابا کی بات کو سچ مان کر تحفہ واپس لے جاتا تو اس پر وہ کبھی ناراض نہ ہوتے اور صرف ہنس دیتے اور اس شخص کو مکار قرار دیتے۔

طبیب بننے سے پہلے ابا نے ہر قسم کا کام کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سنہالی کے

علاوہ پالی، سنسکرت اور انگریزی بھی جانتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے صابن بنایا تھا۔ ایک اور موقعے پر انہوں نے روئی کی پاؤڈر لگانے والی گدیاں بھی بنائی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ شیشے پر پارے کی قلعی کر کے آئینے بنانے کا تجربہ بھی کر چکے تھے۔ ابا دستکاریوں پر ایک کتابچے کے مصنف بھی تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے تین چار سو چھوٹی چھوٹی شیشیاں خریدیں جو انگوٹھے سے بڑی نہ تھیں۔ انہوں نے سب میں تھوڑا تھوڑا پانی اور ایمونیا میں بھگوئی ہوئی روئی کے ٹکڑے ڈالے۔ اس کے بعد ڈھکن چڑھا کر انہوں نے ہر شیشی بیس بیس روپے میں بیچی۔ میرے خیال میں انہیں کبھی یہ سوچنے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ آیا یہ واقعی اچھا کاروبار تھا یہ نری جعل سازی۔ بہر حال ابا کو ان لوگوں کی طرف سے سینکڑوں تعریفی خطوط موصول ہوئے جن کے سر کا سر درد ان شیشوں کو سونگھنے سے جاتا رہا تھا۔ اس طرح کے بہت کام کرنے کے بعد ہی میرے والد نے آخر کار طب کا پیشہ اپنایا۔

طبیب بننے کے بعد ابا نے اپنی آمدنی پر قناعت کی اور لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کی۔ وہ ان نسخوں سے مطمئن نہ تھے جو انہوں نے کتابوں میں پڑھے یا اپنے استاد سے سیکھے تھے۔ وہ نئے نسخے اور طریقہ علاج ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ میں حقیقتاً یہ نہیں جان سکا کہ آیا ابا کے یہ نئے طریقے ان کی مہارت کی وجہ سے کامیاب ہوئے یا ان کے مریضوں کی خوش قسمتی کی وجہ سے۔ میں نے ایک قدامت پسند بوڑھے طبیب کو کہتے سنا ہے کہ جیاسنا اپنے مریضوں کا علاج کلی طور پر ذاتی توہمات اور تصورات کے مطابق کرتا ہے۔

ابا نے ابتدا میں جوشاندوں میں استعمال ہونے والی مختلف جڑی بوٹیوں اور جڑوں کے اوصاف کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ پھر انہوں نے یہاں کچھ اجزاء بڑھا اور وہاں کچھ اجزاء گھٹا کر کتابوں میں دیئے گئے نسخوں میں تبدیلیاں کرنی شروع کر دیں۔ ابا کے انہی میں سے ایک نئے نسخے کو دیکھ کر ہی ان کے ایک پرانے خیالات والے ساتھی طبیب نے کہا تھا کہ وہ طب کے فن کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہے ہیں۔

ہمارے خاندان میں یہ کہانی مشہور ہے کہ کس طرح میرے لگڑ دادا کے ایک بچے کا پاگل پن ایک آیورویدک طبیب کی مدد سے ٹھیک ہو گیا تھا۔ پھر میری والدہ کی بہن ہیں جو اکثر مرگی کے دوروں سے بے ہوش ہو جاتی ہیں……

☆☆☆

مجھے انگریزی سکول میں داخل کروانے کے بعد واپس گھر پہنچتے ہی میں نے ابا کو اماں سے کہتے سنا کہ ہم اروندا کو ڈاکٹر بنائیں گے۔ اس وقت میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی لیکن بہت عرصہ بعد جب میں تقریباً پندرہ برس کا تھا تو مجھے ایسا کرنا پڑا۔

میرے خیال میں ابا مجھے محض اس لیے مغربی طب نہیں پڑھانا چاہتے تھے کہ ان کے خیال میں وہ ہماری طب سے بہتر تھی۔ وہ مشرقی طب کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ایسا سوچنا بھی ان کے لیے ناممکن تھا۔ لیکن ہر کوئی آیورویدک طبیبوں کی نسبت ڈاکٹروں کی زیادہ عزت کرتا ہے۔ جب کسی مریض کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر کو بلایا جاتا تو (حتیٰ کہ اسے بھی جس کا علاج میرے ابا نے کیا ہوتا) اس کے آتے ہی باقی لوگوں کی طرح میرے ابا بھی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوتے۔ ابا کو ایسا کرنا پسند نہیں تھا لیکن انہیں محسوس ہوتا کہ کمرے میں موجود تمام لوگ کھڑے ہوں تو بیٹھے رہنا حماقت ہے۔ اس کے علاوہ ابا لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا وہ ویسے ہی کرتے جیسے دوسرے لوگ کرتے چاہے وہ ان کی مرضی کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ میرے خیال میں اس سب کی وجہ سے اور اس لیے کہ ڈاکٹر بہت پیسہ کماتے ہیں وہ چاہتے تھے کہ میں بھی ڈاکٹر بنوں، اس لیے نہیں کہ وہ آیورویدک کو کسی بھی طرح کمتر سمجھتے تھے۔

لیکن مینڈکوں اور لاشوں کی چیر پھاڑ کے خیال سے ہی مجھے گھن آتی۔ کھلے ہوئے دماغ کی صرف تصویر ہی میرے لیے کراہت انگیز تھی کیونکہ یہ لپٹی ہوئی انتڑیوں کے ڈھیر سے بہت ملتی جلتی تھی۔ ایک مرتبہ میں ایک کتاب دیکھ رہا تھا جو میرا ایک دوست (جو میڈیکل کا طالب علم تھا) اپنے ساتھ لایا تھا۔ ایک تصویر دیکھ کر مجھے تقریباً قے آ گئی۔ میرے دوست نے مجھے بتایا کہ وہ نصابی کتاب نہیں ہے اور اس نے لائبریری سے نکلوائی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اسے مزے اور فائدے دونوں کے لیے پڑھ رہا ہے۔ کتاب میں اس کے علاوہ ان عورتوں اور مردوں کے اعضا اور جسم کی تصویریں بھی تھیں جنہیں آتشک تھی۔ انہوں نے میرے خوف اور گھن میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ اس کے بعد میں کچھ عرصے تک بمشکل کسی عورت کی طرف دیکھ سکتا تھا۔

اور اس طرح جب سینئر امتحانات کے لیے میرے مضامین کا انتخاب کرنے کا موقع آیا تو ابا جان اور میرے درمیان کھٹ پٹ ہو گئی۔ اور تو اور اماں بھی ان کی طرف تھیں۔

''میں مینڈکوں اور لاشوں کی چیر پھاڑ نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے کہا۔ ''خون دیکھ کر ہی میرے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ میں مردہ عورتوں کے ننگے جسموں کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔''

ابا قمیض اتارے ڈرائنگ روم میں پرسکون بیٹھے تھے۔ اماں چھوٹی میز کے قریب کھڑی تھیں جو مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ درحقیقت میں نے یہ الفاظ والدہ کو سنانے کے لیے کہے تھے۔

وہ پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے کچھ نہ کہا لیکن ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرے متعلق ابا کے منصوبوں کی دانائی کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

''تمہیں ہر چیز کا عادی ہونا پڑے گا۔'' ابا نے ہنس کر کہا۔ ''تمہارا یہ ڈر ایک یا دو مینڈکوں کی چیر پھاڑ کرنے کے بعد خود بخود دور ہو جائے گا۔ جتنا تم دیکھو گے کہ ان کے اندر کیا ہے اتنا ہی تمہارا تجسس بڑھتا جائے گا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ میڈیکل کے ایک طالب علم کو لال بیگ کی چیر پھاڑ کرتے دیکھا تھا۔ یہ منظر اتنا دلچسپ تھا کہ میں اس کے ایک لمحے سے بھی محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اور جب میں بچہ تھا تو مجھے لوگوں کو کسی جنگلی سور کی کھال اتارتے اور اس کی آنتیں نکالتے ہوئے دیکھنے کا جنون تھا۔ اگر ایسا ہوتے ہوئے دیکھنا اتنا دلچسپ ہے تو کیا تم نہیں سمجھتے کہ خود ایسا کرنا حقیقتاً ولولہ انگیز ہوگا؟ بہت سے لوگ جو اب ڈاکٹر ہیں انہیں بھی یقیناً شروع میں مینڈکوں کی چیر پھاڑ کرنے سے نفرت ہوگی۔ بیوقوف مت بنو، اروندا۔ صرف اپنے بڑوں کی بات سنو۔''

اماں اپنے وقتی گونگے پن سے نکلیں اور میری طرفداری کی:

''اگر لڑکے کو ڈاکٹر بننا پسند نہیں ہے تو اسے ایسا کرنے پر مجبور کیوں کیا جائے؟ کچھ پتا نہیں اگر ہم اسے چیر پھاڑ کرنے اور بغیر کسی وجہ کے ہر قسم کی چیزوں میں مداخلت

کرنے پر مجبور کریں تو کیا ہو جائے۔ کیا یہ درست ہے کہ تمہیں عورتوں کی لاشوں کی چیر پھاڑ کرنا پڑے گی؟'' اماں نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سچ ہے اماں۔ کیا میں آپ سے جھوٹ بولوں گا؟ مردوں اور عورتوں دونوں کی لاشوں کی۔ کہتے ہیں کہ کچھ طالب علم مردوں اور عورتوں کی لاشیں اکٹھی رکھ دیتے ہیں اور ان کے متعلق ہر قسم کے لطیفے بناتے ہیں۔''

انہوں نے پریشان ہو کر ابا کی طرف دیکھا۔ ابا نے غصے سے انہیں گھورا اور اماں نے فوراً اپنی نظریں جھکا لیں۔ اماں نے مجھے بھی تیوری چڑھا کر چپ رہنے کا کہا کیونکہ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھیں کہ جب ابا کو غصہ آتا ہے تو وہ اپنے اوپر قابو کھو بیٹھتے ہیں اور جو کچھ ان کے دماغ میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں خواہ وہ کوئی ناشائستہ بات ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن ابا تو اتنے برہم تھے کہ وہ پہلے ہی چلا رہے تھے: ''اچھا تو شادی کرنے کے بعد کسی عورت کو تھپکنا اور چومنا ٹھیک ہے لیکن جب وہ مر گئی ہو تو اسے چھونا بھی غلط ہے! بہرحال ایک لاش کسی ایسی زندہ عورت سے جس نے اچھا لباس اور زیور پہنا ہو بہت مختلف چیز ہوتی ہے۔ یہ کسی مرد کو عورت سے متنفر کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ کیا تم نے مذہبی کتابوں میں نہیں پڑھا کہ کس طرح کچھ مرد ایک عورت کا مردہ جسم دیکھنے کے بعد خود زندگی سے نفرت کرنے لگتے ہیں؟ ......اروندا تم عورتوں کی باتوں پر مت جاؤ۔ تم ایک دو ہفتوں میں لاشوں کو چھونے کے عادی ہو جاؤ گے۔ لوگ ہمیشہ کوئی نئی چیز شروع کرنے سے گھبراتے ہیں لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔''

''مردتب شادی نہیں کرتے جب تک ان کی عمر اٹھائیس یا تیس برس نہ ہو۔'' اماں نے کمرے سے جاتے ہوئے کہا۔

''میں نے تیئس برس کی عمر میں شادی کی۔ تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا پھر بھی تم بحث کرنے کی کوشش کرتی ہو۔ اروندا تم اپنی پڑھائی شروع کرو۔ تمہیں ڈاکٹر بننا ہے۔ تمہارے یہ خوف بہت جلد رفع ہو جائیں گے......''

''اگر میں میڈیکل کالج چلا بھی گیا تو میرے ڈاکٹر بننے میں کم از کم چھ سال لگیں گے۔''

''میں کسی نہ کسی طرح تمہارا خرچہ برداشت کرلوں گا۔ رقم کا بندوبست کرنا میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں۔ تمہیں صرف دل لگا کر پڑھنا ہے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔''

انہوں نے لیمپ پر سے شیشے کی چمنی اتار دی اور اسے میز پر رکھ دیا۔ پھر انہوں نے تیلی جلائی اور بتی کو دکھائی۔

''ابھی کل ہی میں تمہارے استاد سے تمہارے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔'' انہوں نے چمنی کو دوبارہ لیمپ پر جماتے ہوئے کہا۔''وہ کہتا ہے کہ تم چیزیں بہت جلد سیکھ لیتے ہوخواہ کوئی بھی مضمون کیوں نہ ہو۔''

برآمدے کی تاریکی لیمپ کی روشنی سے کم ہوگئی جو ڈرائنگ روم کے دروازے اور کھڑکیوں سے اس پر پڑ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں لٹکی ہوئی ایک تصویر بھی روشنی کی زد میں تھی۔ اس میں میرے والد اور والدہ اپنی شادی کے لیے تیار نظر آرہے تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ ابا تصویر میں یقیناً تیئس برس سے زیادہ کے لگتے تھے۔

وہ یوں دکھائی دیتے تھے جیسے انہوں نے کسی قسم کا نمائشی لباس پہن رکھا ہو۔ انہوں نے پتلون پہن رکھی تھی لیکن وہ ایک کپڑے سے ڈھپی ہوئی تھی۔ انہوں نے ڈبل بریسٹ لمبا مردانہ کوٹ بھی پہن رکھا تھا۔ انہوں نے ٹائی، جرابیں اور جوتے بھی پہن رکھے تھے اور مجموعی طور پر خاصے عجیب دکھائی دے رہے تھے۔ سونے پر سہاگہ ایک لمبی مخروطی شکل کا ریشمی ہیٹ تھا جو ان کے ساتھ پڑی ہوئی چھوٹی میز پر دھرا تھا۔ اور پھر بھی آپ تصویر میں واضح طور پر دیکھ سکتے تھے کہ انہوں نے اپنے بالوں کو اپنے سر کے پیچھے گرہ دے رکھی ہے۔ اماں ان کے پہلو میں کھڑی تھیں۔ انہوں نے لمبا گاؤن اور دستانے پہنے ہوئے تھے اور پنکھا پکڑا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ دیہاتی لوگ بھی اگر آج اس تصویر کو دیکھیں تو وہ یہی گمان کریں گے کہ وہ کسی ڈرامے میں کام کرنے یا اسی قسم کی کسی چیز کے لیے بنی ٹھنی ہوئی تھیں۔

سامنے والی دیوار پر میری بہن کی شادی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ بہت مختلف تھی۔ میری بہن نے ساڑی اور بلاؤز پہنا ہوا تھا اور پھولوں کا گلدستہ اٹھا رکھا تھا۔ اس کے شوہر نے صرف کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ درحقیقت میری بہن آج کل کی کسی دلہن ہی کی طرح لگتی اگر اس کے سفیدی مائل چہرے اور سر کے جھکاؤ کا مسئلہ نہ ہوتا۔

ابا باہر برآمدے میں جا چکے تھے۔ انہوں نے باغ میں قدم رکھا اور چھوٹے زینے کی طرف چل دیئے۔ میں خود بھی برآمدے میں آ گیا۔ ڈرائنگ روم سے روشنی برآمدے تک آ رہی تھی لیکن باغ پر پوری طرح تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہ خشک موسم تھا اور ہوا گرم اور سکون بخش تھی۔ سڑک پر دور میں نے کوئی مدھم چیز دیکھی جو ناریل کے تازہ پتے کی مانند دمک رہی تھی۔ ابا چھوٹے زینے کے اور قریب گئے اور باہر کی طرف دیکھا۔ ساز کی جھنکار اور کسی کے بیل کو چمکارنے کی آواز سنائی دی۔ اندھیرے میں صرف سفید چھت اور بیل گاڑی کے چمکتے ہوئے پہیے نظر آ رہے تھے۔

بیل گاڑی ہمارے دروازے پر آ کر ٹھہر گئی۔ ابا گھر کے اندر گئے اور اپنا بیگ لے کر دوبارہ باہر آ گئے۔ وہ یہ کہتے ہوئے بیل گاڑی میں سوار ہو گئے: ''میں ایک مریض کو دیکھنے جا رہا ہوں جس کی حالت نازک ہے۔''

میں نے گاڑی بان کو بیل سے کہتے سنا: ''بیٹا، چلو چلیں۔'' ساز کی گھنٹیاں دوبارہ ٹن ٹنائیں۔ بیل گاڑی کی سفید چھت اندھیرے میں گم ہو گئی۔

''اماں میں ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا، ابا خواہ کچھ بھی کہیں۔'' میں بیل گاڑی کے پہیوں کی کھڑ اکھڑاہٹ ابھی تک سن رہا تھا۔ ان کے دھرے یقیناً پرانے ہو چکے تھے۔ گھنٹیاں بجنے کی مدھم سی آواز ہوا پر تیرتی ہوئی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

''فکر نہ کرو۔ میں تمہاری بہن سے کہوں گی کہ اس سلسلے میں ان سے بات کرے۔ وہ پرسوں یہاں آ رہی ہے۔ لیکن تم ڈاکٹر بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ تمہارے والد کو اس کی اتنی خواہش ہے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اندر چلی گئیں۔ میں لیمپ کی روشنی میں ان کا چہرہ واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔

''اگر یہ مجھے پسند ہوتا تو میں ضرور ایسی کوشش کرتا۔'' میں نے قدرے رکھائی سے کہا۔ '' دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو میں آسانی سے سیکھ سکتا ہوں، لیکن میں مینڈکوں اور لاشوں کی چیر پھاڑ نہیں کر سکتا۔ اور ایسا کیے بغیر ڈاکٹر نہیں بنا جا سکتا۔''

تقریباً پانچ برس پہلے میں ایک مرتبہ اپنی والدہ کے ساتھ ایک قریبی عزیز سے ملنے ہسپتال گیا تھا جو ایک حادثے میں زخمی ہو گیا تھا۔ اس کی ٹانگ پر بندھی ہوئی تمام

پٹیاں خون آلود تھیں۔ اس کے چہرے نے، جو خون سے لتھڑے ہوئے چپکنے والے پلاسٹر سے ڈھکا ہوا تھا۔ مجھے خوفزدہ کر دیا۔ خون اور دوائیوں کی بو سونگھ کر مجھے قے آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا سر چکرا رہا ہے اور میں نے پلنگ کی پٹی تھام لی۔ اس سے پہلے کہ اماں مجھے تھام لیتیں میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ بے ہوش ہونے سے چند سیکنڈ پیشتر مجھے خیال تھا کہ مریض اور ان کے ملاقاتی مجھ پر ہنسیں گے۔ بعد میں اماں نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر تک پہنچنے سے پہلے تک میں مسلسل کچھ بڑبڑاتا رہا تھا۔ میں ایک ہفتے تک بستر سے لگا رہا تھا۔

اس کے بعد جب بھی مجھے یہ واقعہ یاد آیا میں شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے باعث میں ایک ڈرپوک اور لاغر لڑکا ثابت ہوا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر بننے کے خلاف بحث کرتے ہوئے میں خود کو اس واقعے کا حوالہ دینے پر راضی نہ کر سکا۔ لیکن میرے والدین کو اس کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟ شاید انہیں ماضی بعید میں بے ہوشی کے دورے اور میری مردوں کی چیر پھاڑ سے حالیہ نفرت میں کوئی رابطہ نظر نہیں آتا تھا۔

اس کے علاوہ یہ میرے ڈاکٹر نہ بننے کی اکلوتی وجہ نہ تھی۔ مجھے ڈاکٹر، وکیل حتیٰ کہ عالم بننے کی قطعاً خواہش نہیں تھی۔ جب میرے استاد نے یہ کہا تھا کہ میں جو بھی چاہوں سیکھ سکتا ہوں تو صرف ابا کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ یہ صریحاً درست تھا۔ تاہم میں صرف امتحان پاس کرنے یا کوئی پیشہ اختیار کرنے کے لیے نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔ میں کبھی بھی مستقبل کے بارے میں یا روزی روٹی کمانے یا شادی کرنے کے متعلق نہیں سوچتا تھا۔ میں بیشتر دیہاتی لڑکوں کی طرح حال میں زندگی بسر کرتا تھا۔

ہم کبھی مستقبل، دولت، خوشی یا مرتبے کے متعلق سنجیدگی سے نہیں سوچتے تھے۔ ہم تفریح کے سوا کسی چیز کے بارے میں بھی نہیں سوچتے تھے اور جو کچھ ہمارے پاس تھا اور جو کچھ ہم تھے اس پر خاصے راضی تھے۔ ایک موقعے پر میں جغرافیے میں اول آیا، مگر زیادہ دن نہیں گزرنے ہوں گے کہ جغرافیے سے میری دلچسپی کم ہو گئی اور میں تمام وقت تاریخ پر صرف کرنے لگا۔ جب میں اس سے اکتا گیا تو قدرتی علوم کی باری آ گئی۔

میں ہمیشہ جماعت میں اول یا دوم آتا۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ چوتھی پوزیشن سے نیچے آنا میں اپنی بے عزتی سمجھتا تھا اور یہ نہیں کہ زندگی میں کچھ کرنے کی آرزو

تھی۔

''اچھا اس سارے مسئلے کو اطمینان سے حل کریں گے۔'' اماں نے کہا۔ ''اگر تم ڈاکٹر بننے کے اس قدر خلاف ہو تو پھر یقیناً کوئی دوسرا پیشہ ہو گا جسے تم اپنانا چاہتے ہو گے۔''

''ابا کو بڑے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا شوق ہے۔ غالباً وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی ان میں سے ایک بن جاؤں۔''

''بیٹا، ہمیں ایسی خواہش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم انہیں تنہا چھوڑ دو۔ اچھا انسان بننے کی کوشش کرو۔ ہم صرف یہی چاہتے ہیں۔'' انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے والد نے مینکا کی شادی پر بہت خرچہ کیا تھا اور ضلعے کے تمام اہم لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ اس پر لوگوں نے یہ کہا تھا کہ انہوں نے یہ سب کچھ بڑا حکیم اور بڑا وید بننے کی امید میں کیا ہے۔ انہوں نے کبھی اس کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔''

لیمپ پھڑ پھڑایا۔ اماں نے بتی نیچی کر دی۔ دیواروں کی سفیدی قدرے ماند پڑ گئی۔

اماں ہر قسم اور ہر طبقے کے دیہاتی رشتے داروں سے میل جول رکھ کر خوش تھیں، مگر ابا شہر کے لوگوں سے میل ملاپ کو بہت بڑی چیز سمجھتے تھے۔ اماں کی طرح میں بھی شہریوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا۔

دوسرا باب

میری بہن اور اس کے شوہر نے ابا کے ساتھ کافی وقت گزارا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے مجھے کسی اور پیشے کی تعلیم دلوانے پر راضی کرنے کے امکانات پر بھی بات چیت کی۔ بظاہر کوئی بھی یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ میں صرف امتحانات کے لیے محنت نہیں کرتا تھا۔ میں مزے کے لیے پڑھتا تھا، مستقبل کو پیش نظر رکھ کر نہیں ۔ جو بھی میرے ذہن پر سوار ہو جاتی میں اسے سیکھنا چاہتا اور چاہتا کہ اس قابل ہو جاؤں کہ جب بھی میرا دل ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کو کرنا چاہے تو میں ایسا کرسکوں۔

میں اپنے والدین کو ذرا بھی ناراض نہیں کرسکتا تھا۔ بعض اوقات میں یہ بھی سوچتا کہ اگر میں گھر چھوڑ دوں اور ادھر ادھر گھوموں پھروں، وہ کروں اور سیکھوں جو مجھے پسند ہے تو یہ سب سے بہتر ہوگا۔ مجھے ابا سے محبت تھی۔ مجھے اماں سے ان سے بھی زیادہ محبت تھی لیکن مجھے اپنے گھر اور طرز زندگی کی پرواہ نہیں تھی۔ ہر روز ابا بستر سے اٹھتے ہی باغ میں جاتے۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ درختوں کے نیچے ادھر سے ادھر چہل قدمی کرتے۔ وہ ٹھنڈی ہوا اور دھند سے بے خبر رہتے سوائے اس کے کہ بعض دنوں میں وہ اپنے سر کے گرد تولیہ لپیٹ لیتے۔ بحیثیت طبیب انہیں بہتر پتا ہونا چاہیے تھا لیکن خواہ کتنی بھی سردی کیوں نہ ہو وہ اپنی اس عادت پر قائم رہتے۔

اور پھر انہوں نے ناشتے میں چاول کا دلیہ کھانا ہوتا۔ ناریل کے دودھ میں پکے ہوئے چاول جنہیں شکر سے میٹھا کیا گیا ہو۔ کوئی بھی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ وہ بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ مصیبت یہ تھی کہ مجھے ہر روز صرف اس لیے یہ کھانے پر مجبور کیا جاتا

کہ یہ ابا کی عادتوں میں سے ایک تھی۔

ان کے صبح کے کام کا آغاز مریضوں کو دیکھنے اور نسخے لکھنے سے ہوتا۔ باندا کو گولیوں اور سفوف کے لیے دوائیں پیسنے اور تیل بنانے کے لیے جڑی بوٹیاں ابالنے کا حکم دیا جاتا۔ پھر ابا دن میں دو مرتبہ اپنے دوروں پر جاتے۔ وہ اکثر سہ پہر دو بجے تک باہر رہتے۔ یہ معمول سال کے تین سو پینسٹھ دن برقرار رکھا جاتا سوائے پورن ماشی کے۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ بہت سا پیسہ بنانا چاہتے تھے۔ اگر اماں نہ ہوتیں تو وہ اپنی دوائیوں کے بہت تھوڑے یا بالکل بھی پیسے نہ لیتے۔ اگر اماں نے کڑی نگاہ نہ رکھی ہوتی تو انہوں نے مریضوں کو دوائی کی قیمت کے بدلے میں لائے ہوئے تحفوں میں سے آدھے واپس لے جانے پر مجبور کر دیا ہوتا۔

بظاہر ابا اپنے پیشے سے بہت اطمینان اور خوشی حاصل کرتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی کسی اور چیز میں تفریح تلاش کرتے نہیں دیکھا تھا،سوائے سال میں ایک اور موقعے کے جب نئے سال کا تہوار آتا تھا۔تہوار سے دو دن پہلے وہ سات یا آٹھ دوستوں کے ساتھ پیسے لگا کر تاش کھیلنے ایک ایسی محفل میں بیٹھ جاتے جو نئے سال کے پہلے دن ختم ہوتی۔ وہ یہ دو دن راتیں مسلسل تاش کھیلتے رہتے۔ ان کے لیے کھانا لے کر جانا پڑتا اور کبھی کبھی وہ چائے کی فرمائش بھی کرتے۔ وہ بہت اچھا وقت گزارتے۔ جہاں تک اماں کا سوال ہے مجھے شک ہے کہ انہوں نے کبھی اتنا لطف اٹھانے کے متعلق سوچا بھی ہو گا۔ میرے خیال میں انہیں ابا اور ان کے جواری دوستوں کے لیے لذیذ کھانے تیار کرنے میں مزا آتا تھا۔ اپنی دو دنوں پر محیط محفل کے اختتام پر وہ تمام رقم، جو کبھی چھ سات ہزار روپے سے کم نہ ہوتی، جمع کرتے اور یہ کہتے ہوئے اماں کو تھما دیتے: ''ہم اگلے سال بھی آپ کی مہمان نوازی کا لطف اٹھانے کی امید رکھتے ہیں۔''

میں ابا کی فطرت کے ایک رخ سے آگاہ ہو گیا جو بہت واضح تھا اور ان کے لیے میری محبت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

آہستہ آہستہ لوگوں کی کہی اور کی ہوئی چیزوں سے مجھے احساس ہو گیا کہ ابا نے اپنے مریضوں سے عزت اور محبت کمائی ہے۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ عین ان کی وفات

کے موقع تک میں نے کبھی کسی کو بحیثیت طبیب ان کے رویے پر تنقید کرتے نہیں سنا تھا۔ ''بہترین معالج''، ''ہمیں ان کے لیے دعا کرنی چاہیے۔'' ''انہوں نے مجھے دوائی حتیٰ کہ دودھ بھی مفت دیا۔'' میں اکثر کسانوں کو ایسی باتیں کہتے سنتا۔ وہ یہ سب باتیں پورے خلوص اور ابا کو مکھن لگانے کے کسی ارادے کے بغیر کہتے۔

اکثر جب انہیں کسی ایسے شخص کو دیکھنے کے لیے بلایا جاتا جو بہت زیادہ بیمار ہوتا تو وہ رات کے ایک یا دو بجے بھی چلے جاتے۔ وہ اندھیرے، آندھی حتیٰ کہ بارش کی بھی پرواہ کیے بغیر جلدی جلدی کپڑے پہنتے اور فوراً چلے جاتے۔ سو میں سے ننانوے موقعوں پر ان کے لیے بیل گاڑی بھیجی گئی ہوتی نہ کہ کار۔ بیشتر موقعوں پر ان کی واپسی تب ہوتی جب آمد سحر کے وقت مرغ بانگ دے رہے ہوتے۔ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ دیر ہو جاتی۔ جب سورج بہت پہلے کا نکل چکا ہوتا اور کوے شور مچا رہے ہوتے۔

اماں انہیں ایک سے زیادہ مرتبہ روکنے کی کوشش کرتیں: ''اس سے کہہ دو کہ تم صبح آؤ گے۔'' وہ کہتیں۔ ابا ان کی بات پر کان نہ دھرتے لہٰذا وہ بعض اوقات دستک سنتے ہی دروازے کی طرف دوڑ کر ان کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرتیں:

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میرا بٹیا بہت بیمار ہے۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔ میں ویدجی کو اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں......''

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے بیماری بتاؤ۔ میں تمہارے لیے نسخہ لکھوا لاتی ہوں۔''

اگر ابا جاگ رہے ہوتے تو وہ یقیناً دروازے پر جاتے۔ اگر انہیں بیماری خطرناک لگتی تو وہ بلانے والے کے ساتھ فوراً چلے جاتے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس شخص کو کچھ گولیاں اور جوشاندے کا نسخہ دے دیتے۔ اگر انہیں دوبارہ نہ بھی بلایا جاتا تو وہ اگلی صبح مریض کو دیکھنے ضرور جاتے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو ان سے حسد کرتے تھے وہ بھی بعض اوقات ان کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکتے:

''اس کے طبیب بننے کے بعد ہی ہمیں پتا چلا کہ وہ کیا کرسکتا ہے۔''

''جس شخص نے دنیا کا ہر کام کرنے کی کوشش کی وہ آخر کار اچھا طبیب بن گیا!وہ کتنا بدل گیا ہے!''

لوگ ان کی وفات کے بعد ان کے گن گاتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حددرجے کے کنجوس، ٹھگ یا دھوکے باز کو بھی جنازے والے دن کسان اچھا الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ لیکن اگر لوگ کسی شخص کی وفات کے سات، آٹھ یا بارہ مہینے بعد بھی اس کی تعریفیں کرتے رہیں تو پھر ان میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوگی۔

مجھے یہ پتا چلا کہ ایک دو شائستہ اور مہذب لوگوں کو ابا کی ہمدردی اور خلوص کے متعلق شبہات تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ آیا ان کی سخاوت اور اہم لوگوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی خواہش کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ ''غالباً وہ اس لیے زیادہ منافع کمانے کی کوشش نہیں کرتا کہ اسے اس کے بدلے حکومت سے کوئی اعزاز ملنے کی امید ہے۔'' ایک ایسے شخص نے کہا جس کی عزت کرنے کی میرے پاس تمام وجوہات تھیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ آیا ابا ایسی عزت کی آرزو کرتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے بھی تھے تو وہ اسے بڑی مہارت سے چھپانے میں کامیاب رہے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ انھوں نے کبھی کوئی ایسی چیز کہی یا کی ہو جس سے ایسی کسی خواہش کا اظہار ہوتا ہو۔

اماں کو شبہ تھا کہ کچھ لوگ صرف ابا کو مکھن لگا رہے ہیں۔ انہیں کبھی اس قسم کے شبہات کا اظہار کھل کر نہ کیا لیکن میرے خیال میں ابا ان کے خیالات سے بے خبر نہیں تھے۔

ایسا بھی ہوتا جب کوئی مریض ان کے منہ پر ان کی تعریف کر دیتا۔

''کافی ہے۔ کافی ہے۔'' ابا کھلم کھلا ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتے۔ ''اگر میری بیوی نے تمہاری بات سن لی تو تمہیں آئندہ مفت دوائی نہیں ملے گی۔'' انہیں کمینگی اور بناوٹ سے نفرت تھی اور وہ یہ نہیں مان سکتے تھے کہ لوگ تعریف کرنے میں بھی بد دیانت ہو سکتے ہیں۔

وہ اکثر اپنے دوروں سے پسینے میں بھیگے ہوئے لوٹتے۔ ''کیا مینکا اور دھرم داس آگئے ہیں؟''

''ابھی تک تو نہیں آئے۔''

مزید بات چیت کیے بغیر وہ اس کمرے میں چلے گئے جہاں باندا کسی چیز کو کالا لیپ بنانے کے لیے رگڑ رہا تھا۔ باندا کی حرکت تیز ہو گئی۔ ابا تھوڑا سا لیپ اٹھانے کے لیے جھکے۔ انہوں نے اسے اپنی انگلیوں کے درمیان دبایا۔

''ٹھیک نہیں ہے۔ بہت کنکریلا ہے۔ اپنی رگڑائی میں تھوڑی جان ڈالو۔''

اپنی کمر کے گرد لپٹے کپڑے کو کھولتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اپنا سانس بحال کرنے کے لیے کچھ دیر تک بستر پر لیٹنے کے بعد وہ دوبارہ باندا کو دیکھنے چلے گئے جو آرام کرنے کے لیے رک چکا تھا۔ ابا ایک مرتبہ پھر سے لیپ کو پرکھنے کے لیے هاون دستے کے قریب بیٹھ گئے۔

''ابھی ٹھیک نہیں ہوا۔'' انہوں نے باندا سے دستہ لے لیا اور پوری قوت سے رگڑائی شروع کر دی۔ مواد نرم مٹی میں تبدیل ہو گیا۔ جب انہوں نے دستہ باندا کو واپس کیا تو وہ ہانپ رہے تھے۔

''اسے تھوڑا اور رگڑو۔ یہ مریضوں کو دینا ہے۔ تم اسے باورچی خانے کے لیے نہیں رگڑ رہے۔''

باندا دوبارہ مستعدی سے اپنے کام میں جت گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی آنکھ کے کونے سے ابا کو بھی دیکھ رہا تھا۔

ایسا صرف باندا کے ساتھ نہیں تھا۔ ابا گھر میں ہونے والی کسی بھی چیز میں دخل اندازی کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ لوگوں کی غلطیاں نکالنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف چیزوں کو صحیح طرح ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔

☆☆☆

مینکا اور دھرم داس اس دن دیر سے آئے لہٰذا میرے مستقبل کے متعلق بحث صرف دوپہر کے کھانے کے بعد ممکن ہوئی۔ اماں اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتی تھیں لیکن انہیں دھرم داس کی رائے پر زیادہ اعتماد تھا۔ اس کی فطرت سیدھی سادی تھی جو اس کی خوش اطوار آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ اس کے لب مسکراہٹ کے لیے کھلے رہتے تھے۔ خواہ وہ مینکا

کے ساتھ آتا یا اس کے بغیر اماں اس کا گرمجوشی سے استقبال کرتیں۔

درحقیقت اماں گاہے بگاہے کوئی ایسی بات کہہ دیتیں جس سے پتا چلتا کہ انہیں مینکا کے متعلق شکوک وشبہات ہیں۔ اس طرح کے کچھ اشارے سننے کے بعد ہی میں نے مینکا کی چالاکی کو محسوس کرنا شروع کیا۔ اماں کو ہمیشہ سے یہ احساس تھا کہ مینکا ہوشیاری سے اپنے والدین کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے طریقے اور راہیں ڈھونڈتی رہتی ہے۔

اماں نے سری مل کو پکڑا جو ان کے قریب کھیل رہا تھا اور اسے چوم لیا۔

''میرا پوتا بالکل اپنے باپ جیسا ہے!'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ سری مل نے منہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور ہنسنے لگا۔ ابھی اس کا کوئی دانت نہیں نکلا تھا اور صرف مسوڑھے ہی نظر آرہے تھے۔

''یہ کس پر گیا ہے؟ اپنے باپ پر یا مجھ پر؟'' مینکا نے مجھ سے پوچھا۔

''دونوں پر!''

میں صرف اسے خوش کرنا چاہتا تھا اور میں نے بچے کو قریب سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میرا نہیں خیال کہ حقیقت میں وہ ان دونوں میں سے کسی سے بھی مشابہت رکھتا ہو۔ میں نے اس کی طرف زیادہ غور سے دیکھا۔ غالباً اس کے نقوش ان دونوں کے نقوش کا مجموعہ تھے۔

''سنو! اروندا نے سچ کہا ہے!'' مینکا کافی خوش تھی۔

جب اس نے ابا کو آتے ہوئے دیکھا تو اٹھ کھڑی ہوئی اور ان کو کرسی پیش کر دی۔

خشک موسم میں ابا گھر پر قمیض پہنے رہنا پسند کرتے تھے۔ ان کا جسم خاصا شاندار تھا اور کندے کسی نوجوان کی طرح چوڑے تھے۔

''اب آپ کو اتنی تگ و دو نہیں کرنی چاہیے۔'' مینکا نے کہا۔ ''آپ کو رات کے وقت مریضوں کے بلانے پر نہیں جانا چاہیے۔ آپ آرام کیوں نہیں کرتے؟''

''میں تو انہیں بہت دیر سے، حتیٰ کہ تمہاری شادی سے بھی پہلے سے کہہ رہی ہوں کہ رات کے وقت مریضوں کے بلانے پر نہ جایا کریں۔'' اماں نے کہا۔

''ابا اب اتنے صحت مند نہیں ہیں جتنے پہلے ہوا کرتے تھے۔''

مینکا کی شادی کو بمشکل پانچ برس ہوئے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ابا اس دوران بالکل بھی نہیں بدلے تھے۔ لیکن اپنے بچپن میں بھی مینکا صورت حال کے مطابق الفاظ چننے میں ماہر تھی۔ اماں کو یہ فن نہیں آتا تھا اور نہ ہی یہ ہنر میرے پاس تھا۔ ابا ہمیشہ اپنے دل کی بات صاف صاف کہتے، بغیر وقت یا جگہ کی پرواہ کیے۔ لیکن مینکا نہ صرف موقع کی مناسبت سے بات کرتی بلکہ وہ ذو معنی باتیں کرنے میں بھی ماہر تھی۔

ابا نے اپنے سینے پر پھونکیں مارنا شروع کر دیں اور تاڑ کے پتے کا پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ مینکا پنکھا ان سے لے کر خود جھلنے لگی۔

چھت کی اینٹیں اس طرح تپ رہی تھیں جیسے وہ کسی بھٹی میں ہوں اور پورے گھر کو گرم کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اپنی صدری اتار دینا بہتر ہوگا۔ شدید گرمی سے ہوا تپ رہی تھی اور سرنگوں بیل بوٹوں کی ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ، جو کانوں یا غالباً دماغ کے لیے تکلیف دہ تھی، آہستگی سے ہلنے پر مجبور کر رہی تھی۔

ابا گھر کے خرچ کے لیے اماں کو باقاعدگی سے کچھ رقم دیا کرتے تھے۔ جب مینکا کی شادی ہوئی تھی تو وہ بعض اوقات اسے پیسے دے دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے گولک میں ڈالنے کے لیے سات یا آٹھ روپے بچا لیتی تھی۔ پھر مینکا وہ رقم بھی بچا لیا کرتی تھی جو ابا اسے نئے سال کے تحفے کے طور پر دیا کرتے تھے۔ جو بھی رقم اس کے ہاتھ لگتی وہ اسے جمع کر لیتی۔ مجھے اماں کا اس سلسلے میں اس سے لڑنا بھی یاد ہے۔

مینکا پرانے اخبار، بوتلیں اور تانبے کے ٹکڑے بھی جمع کیا کرتی تھی اور اپنی پونجی میں اضافہ کرنے کے لیے انہیں بیچ دیتی تھی۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اس کے بینک میں سوا دس ہزار روپے جمع تھے۔ اس نے کم از کم دس برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کیے تھے، جیسے کوئی دیمک اپنا گھر بناتی ہے۔ ابا نے اسے جہیز میں مزید بیس ہزار روپے دیے۔

جو ساڑیاں ابا نے اسے مختلف موقعوں پر دیں ان میں سے چھ کو اس نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ جب اس کی شادی ہوئی تو ابا نے اسے چار اور ساڑھیاں دیں اور اس کے جہیز کے ساتھ دس ساڑھیاں اس کے نئے گھر بھجوا دیں۔ اس کے باوجود وہ جب بھی ہم سے ملنے آتی

اس نے کوئی پھٹی پرانی ساڑھی پہنی ہوتی۔

''تم صرف ایسی پھٹی پرانی ساڑھیاں ہی کیوں پہنتی ہو؟'' اماں نے ایک دن اس سے پوچھا۔

''جب میں اپنے گھر آؤں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں نے کیا پہنا ہوا ہے۔'' مینکا نے جواب دیا۔

''اس کی کپڑوں والی الماری ساڑیوں سے بھری پڑی ہے۔ میں اسے مزید ساڑھیاں اس لیے خرید کرنہیں دیتا کیونکہ یہ وہ بھی نہیں پہنتی جو اس کے پاس ہیں۔'' دھرم داس نے خوش مزاجی سے کہا۔

''کیا تم انہیں اپنے اگلے جنم کے لیے بچا کر رکھ رہی ہو؟'' اماں نے قدرے کوفت سے پوچھا۔

''میرے پاس اتنی بھی ساڑھیاں نہیں ہیں۔''

سونے کے ہلکے کڑے جو مینکا نے ایک بازو میں پہن رکھے تھے اس کی گھنٹی جیسی آواز کو مناسب خراج پیش کرتے تھے۔ اس کا چھوٹا سا منہ، جو لوگوں کو پریشان کرنے میں اتنا ماہر تھا، پتلے نتھنوں اور چوڑے چہرے کی تلافی کرتا تھا۔ وہ زور وشور سے گفتگو کرتی تھی۔ اس کا سر اوپر نیچے ہلکورے کھا رہا ہوتا اور اس کی بالیاں رقص کر رہی ہوتی تھیں۔

جب وہ بالآخر مستقبل کے متعلق بحث کرنے لگے تو دھرم داس نے ابتدا مجھے یہ بتانے سے کی کہ ڈاکٹر ہونا کتنی شاندار چیز ہے۔ بات کے خاتمے پر وہ کہہ رہا تھا: ''اگر اسے واقعی یہ پسند نہیں ہے تو ہمیں اسے اس پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پاس معقول وجوہات ہیں۔''

''اروندا کو میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کے لیے پڑھنا چاہیے۔'' ابا نے اصرار کیا۔ یہ واضح تھا کہ وہ اپنی رائے پر قائم رہیں گے۔ اماں نے میری طرفداری کی اور کہا: ''اروندا کو کوئی ایسی چیز کرنے پر مجبور کیوں کیا جائے جو اسے ناپسند ہے؟ لڑکا بگڑ بھی تو سکتا ہے۔'' دھرم داس نے اماں سے اتفاق کیا۔

حیرت انگیز طور پر مینکا خاموش تھی۔ وہ کسی ایسی بلی کی مانند تھی جو دہلیز پر بیٹھی کسی

بھی طرف جانے کے لیے چوکس ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے اماں سے اختلاف کر کے ابا کی خوشامد کرنے کو پسند کیا ہوتا لیکن وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اماں اس پر ٹوٹ پڑیں گی۔

''اگر ڈاکٹر بننا ہے تو مجھے سینئر امتحانات کے بعد مزید چھ یا سات برس پڑھنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''اس سلسلے میں یقیناً کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'' مینکا نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''رقم کا بندوبست کرنا میرا کام ہے۔'' ابا نے کچھ ناراضگی سے کہا۔'' تم لوگ اس جھنجھٹ میں مت پڑو۔''

ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مینکا نے اتنے لمبے عرصے تک پڑھنے کے جسمانی اور ذہنی تناؤ کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ وہ اس طرح بات کر رہی تھی جیسے اس نے خود طویل دورانیے کے ذہنی تناؤ کا تجربہ کیا ہو۔ میں نے خود اپنی صلاحیتوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیا اور امتحانات کے لیے میری ناپسندیدگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''میرے خیال میں اروندا کو کیمسٹری پڑھنی چاہیے۔'' دھرم داس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ابا بہت بے دلی سے مان گئے۔

وہ ایک شخص سے جو ابھی ابھی اندر آیا تھا بات کرنے باہر برآمدے میں چلے گئے۔ اس شخص کے تاثرات اور اشاروں سے واضح طور پر پتا چلتا تھا کہ وہ کسی ایسے مریض کو دیکھنے کے لیے ابا کو بلانے آیا ہے جس کی حالت نازک ہے۔ ابا دہشت زدہ اور بے چین دکھائی دیتے تھے اور ان کے چہرے پر ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں ایک افسردہ اور اداس رنگ غالب آ گیا۔

''ابا، آپ یقیناً تھکے ہوئے ہوں گے۔'' مینکا نے کہا۔

''کیا ہو سکتا ہے؟ مریض کی حالت نازک ہے۔ مجھے جانا پڑے گا۔'' وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور کپڑے پہنے اور اپنا بیگ اٹھائے ایک لمحے میں دوبارہ باہر آ گئے۔

''کیا آپ جانے سے پہلے تھوڑا سا آرام نہیں کر سکتے؟'' مینکا نے پوچھا۔

''میں واپس آنے کے بعد آرام کرسکتا ہوں۔''

ابا اور انہیں بلانے کے لیے آنے والا آدمی بیل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ جیسے ہی وہ چلی گھنٹیاں ٹن ٹنائیں اور پہیے کھڑکھڑائے۔

کچھ لمحوں بعد میں نے ڈرائنگ روم کا لیمپ جلا دیا۔ ابھی زیادہ اندھیرا نہیں ہوا تھا اور شام کی روشنی میں لیمپ کی روشنی دھیمی اور بے جان دکھائی دیتی تھی۔ کمزور روشنی بظاہر مینکا کے چہرے پر افسردگی کے ایک خاص رنگ کو نمایاں کر رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ جب بھی وہ ابا کی بات کرتی ہے تو اداس کیوں نظر آتی ہے۔ شاید وہ ڈرتی تھی کہ ابا خود کو اپنے مریضوں پر وار دیں گے یا پھر غالباً اس نے اس بدقسمتی کو محسوس کر لیا تھا جو ان کی منتظر تھی۔

ان کی بیل گاڑی چھوٹے زینے کے قریب تک لائی گئی۔ گہرے جھٹ پٹے میں لیمپ مگرمچھ کی آنکھوں کی طرح چمک رہا تھا اور بیل گاڑی کے جوے اور بم کو دیکھ کر کسی مہیب تھوتھنی کا خیال آتا تھا۔ مینکا اور دھرم داس اندر بیٹھ گئے۔ اماں نے سری مل کو ان کو گود میں دینے سے پہلے چوما۔

تیسرا باب

کیمسٹری اس وقت میرے لیے اتنا ہی مخفی علم تھا جتنا کہ جادو اور کیمیا گری۔ مجھے ان کے درمیان بہت کم فرق نظر آتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان دونوں میں سے کسی علم کے گہرے مطالعے سے میرے اندر معجزے دکھانے کی طاقت پیدا ہو جائے گی اور کائنات کے تمام اسرار کی کنجی میرے ہاتھ میں آجائے گی۔ بارود اور آتش بازی شاندار ایجادات تھیں۔ کیمسٹری، کیمیا گری، جادو......میرے نزدیک یہ ایک ہی بوری سے نکلے ہوئے نمک کے ڈھیلوں کی مانند تھے۔ میں نے صاحب علم لوگوں کو، حتیٰ کہ اپنے والد کو بھی، یہ کہتے سنا تھا کہ جدید سائنس کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی مذہبی کتاب کا۔ یقیناً ابا صرف اس لیے یہ چاہتے تھے کہ میں کیمسٹری پڑھوں کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح مجھے زیادہ بہتر ملازمت مل سکتی تھی۔ لیکن میں اس کی طرف ایک بالکل مختلف وجہ سے متوجہ ہوا۔ میرا خیال تھا کہ یہ میرے لیے کائنات کے تمام پنہاں راز آشکار کر دے گی۔

جب میں کالج میں گیا تو سائنسی کہانیوں کے مطالعے نے میرا یہ یقین پختہ کر دیا کہ کیمسٹری حقیقتاً ایک قسم کا مخفی علم ہے۔ اس کے باوجود کہ میں سائنس میں جماعت میں دوسرے نمبر پر تھا میں نے سائنس کی تمام نصابی کتابیں، جو مجھے پڑھنا چاہیے تھیں، نظر انداز کر دیں۔ اس کی بجائے میں اپنا وقت ہر قسم کے کیمیائی تجربات کرنے یا پھر ان کتابوں کو پڑھنے میں گزارتا جن میں کیمیائی تجربات کے فارمولے ہوتے تھے، مثلاً ''کیمسٹری کے معجزے۔'' یہ سلسلہ تین چار ماہ تک چلتا رہا۔

میرے ابا، جو ہمیشہ سائنس کے مطالعے کے لیے میری حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کرتے رہتے، مجھے اکثر کتابوں کی کسی دکان پر لے جاتے اور کہتے: ''اپنے لیے سائنس کی کوئی کتاب چن لو۔'' میں ہمیشہ کسی ایسی کتاب کا انتخاب کرتا جس میں سائنس کو کسی دیومالائی جیسا بنا کر پیش کیا گیا ہوتا۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ میرے اوپر ایک ایسی کیفیت طاری کر دیتا جو کسی افیمی کی بیخودی سے زیادہ مختلف نہ ہوتی۔

میرے استاد نے محسوس کیا کہ سائنس میں میرے نمبر کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے ہمدردانہ مشورہ دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے مجھے سزا بھی دی۔ مجھے سختی سے سمجھایا بھی۔ ان کی اس بے عزتی سے شرمندہ ہو کر میں نے دوبارہ اپنی کتابوں کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔ لیکن میری یہ توجہ بھی ایک دو مہینوں کے بعد کم ہونا شروع ہو گئی۔

بعض اوقات یہ احساس مجھے سخت اذیت پہنچاتا کہ میں اپنے والدین کو دھوکا دے رہا ہوں جو میری تعلیم کے اخراجات برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ میں امتحان میں کامیاب ہو جاؤں۔ مجھے یقین تھا کہ ایسا میں آسانی سے کر سکتا ہوں۔

میں اپنے کالج کے ساتھیوں کے ساتھ کھیلوں میں بہت پر جوش حصہ لیتا۔ میں کبھی تھکن محسوس نہ کرتا اور تب تک کھیلتا رہتا جب تک پسینہ میرے چہرے اور جسم سے ٹپکنے نہ لگتا۔ میرے کئی دوست میرے بظاہر کمزور جسم کے نہ تھکنے پر حیران تھے۔ میری بہن مینکا مجھ سے بھی زیادہ دبلی ہے اور وہ بھی جتنا زیادہ کام کرتی ہے اس سے وہ لوگوں کو حیران کر دیتی ہے۔

ہمارا کھیل کا میدان بے حد وسیع و عریض تھا اور اس میں ہر طرف بجری بکھری ہوئی تھی۔ خشک موسم میں گرمی اتنی شدید ہوتی کہ دس بجے تک سخت زمین اسے دھات کی کسی پلیٹ کی مانند منعکس کرتی جس سے ہماری آنکھیں چندھیا جاتیں۔ ایک مرتبہ ایک تقریباً پچاس سالہ گنجا استاد صرف پندرہ منٹ میدان میں ہمارے ساتھ رہنے کے بعد بیہوش ہو کر گر پڑا۔

تاہم کالج کے کھیل کے میدان میں بھاگ دوڑ میرے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اپنے گھر کے آس پاس ریتلے علاقے میں آوارہ گردی کرنے سے میرے پیروں کے تلوے سخت ہو چکے تھے۔ یہاں پر ریت بعض اوقات اس قدر گرم دکھائی دیتی تھی جیسے اس سے روئی کے گیند کو آگ لگ سکتی ہو۔ میرا سر دھوپ کی تپش کا عادی ہو چکا تھا۔

میرے استاد، جو کہ بمشکل چالیس برس کے تھے، مجھے میرے والد یا پھر غالباً ایک دوست کی طرح چاہتے تھے لیکن میں ان کی تمام محبت اور چاہت کو وبال جان سمجھتا تھا۔ جو لڑکے انہیں ناپسند کرتے تھے وہ مجھے بھی ناپسند کرتے تھے۔ دوسرے لڑکے مجھ سے دوستی کرنے اور مجھے دعوتیں کھلانے کی کوشش کرتے کیونکہ میں استاد کا چہیتا تھا۔ ان کی کوششوں کے باوجود میں ان سے ایک فاصلہ رکھتا۔ اس کے برعکس میں صرف ان دو تین لڑکوں سے دوستی کرنے کی خواہش رکھتا تھا جو بظاہر مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔

بعض اوقات میں یہ امید کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ یہ لڑکے، جن میں سے بیشتر احمق تھے، میری ذاتی قابلیت کی وجہ سے یا پھر اس وجہ سے کہ استاد کی نظر میں میرا مقام اونچا ہے میری عزت کرنا شروع کر دیں گے۔ ان میں سے دو لڑکے خاصے ہوشیار تھے اور میں خاص طور پر اس بات کا متمنی تھا کہ انہیں اپنے بارے میں اچھی رائے رکھنے پر مائل کروں۔ ان بہت سی چیزوں کے پیچھے بھی یہی تحریک کارفرما تھی جو میں نے بعد میں کیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں تمام زندگی تنہا رہا ہوں۔

جن لڑکوں نے میرے ساتھ دوستی کی وہ اتنے مستقل مزاج تھے کہ بعض اوقات مجھے ان کے ساتھ شامل ہونا پڑتا۔ لیکن جب بھی ممکن ہوتا میں ان سے بچنے کی پوری کوشش کرتا اور تنہا کالج جانے اور واپس آنے کی کوشش کرتا۔

ایسے موقعے بھی آتے جب میری غلطی پر کسی اور کو ڈپٹ دیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے دوست مجھے بچانے کے لیے جھوٹ بول دیتے۔ میں اندرونی طور پر ان سے نفرت کرتا تھا۔ اور میں اتنی آسانی سے ان کی بات مان لینے پر استاد سے بھی نالاں تھا۔

ایسے محسوسات کی وجہ سے میں تنہائی کا مزید عادی ہوتا چلا گیا۔ جب میں کالج میں تھا تو ہماری مسلسل باتیں اور کھیل مجھے اس تنہائی کو محسوس کرنے سے بچائے رکھتے جو

اب میرے ذہن کو صرف اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب میں نے کالج چھوڑا اور روزی روٹی کمانی شروع کی تو میری تنہائی بتدریج بڑھتی گئی۔ میری داخلی آنکھ میرے دل کے گوشوں پر مرکوز ہو گئی۔

محنت طلب کھیلوں کے لیے بھی میرا جوش و جذبہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔

اگرچہ میرے لیے کالج کے دوستوں کی یاد ہمیشہ خوشگوار رہی لیکن میں نے کالج چھوڑنے کے بعد کبھی حقیقتاً ان سے دوبارہ ملنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ بعض اوقات میں سوچتا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں لیکن میں اس خیال کو نظر انداز کرتا رہتا حتیٰ کہ اس میں میری دلچسپی ختم ہو جاتی۔ کالج چھوڑنے کے بعد میں صرف اپنے ذہن کی دنیا میں نے رہنے کی کوشش کی۔

اگر آپ یہ آپ بیتی آخر تک پڑھیں تو آپ یقیناً یہ سوچیں گے کہ مروجہ رسم و رواج کی پرواہ نہ کرنا میری بہت بڑی بیوقوفی تھی اور اسی وجہ سے مجھے تکلیف اٹھانا پڑی۔ میں نے خود کبھی ایسا نہیں سوچا۔

کوئی بھی دو آدمی جسامت میں ایک جیسے نہیں ہوتے ۔ روحیں ایک دوسرے سے اس سے بھی زیادہ مختلف ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر بعض لوگ دنیاوی چیزوں میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں جبکہ میری دلچسپی کبھی بھی ان میں نہیں رہی۔ نہ ہی کبھی حسیاتی لطف کا رسیا رہا ہوں۔ حتیٰ کہ میں نے کبھی کسی چیز کے لیے اتنی شدید خواہش یا جذبہ محسوس نہیں کیا جس کے لیے خود پر جبر کرنے کی ضرورت پڑی ہو۔ یہ درست ہے کہ میں جذبات سے عاری دکھائی دیتا رہا ہوں کیونکہ میرے جذبات نے میرے جسم سے رہائی حاصل کر لی تھی۔ جن لوگوں نے یہ دریافت کیا کہ مجھ میں جذبات موجود ہیں وہ مجھے منافق قرار دیتے ہیں۔

صرف دو لوگوں نے مجھے اپنے جذبات کے رحم و کرم پر دیکھا ہے: وہ دونوں عورتیں جن سے میں نے محبت کی اور بہت مختلف طریقوں سے محبت کی۔

☆☆☆

آج بیساکھ کی رات تھی۔ میرے والد اور والدہ یہ دیکھ کر بے انتہا خوش تھے کہ ہمارا برآمدہ اور باغ دوستوں اور رشتے داروں سے بھرا ہوا تھا جو اس جلوس کا انتظار کر رہے

تھے جو ہر سال ہمارے گھر آتا تھا۔ جلوس کے ہمراہ چھکڑے میں بھجن گانے والے بھی آتے تھے۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ بھجن گانے والوں کا جلوس صرف دو گھروں کے سامنے رکتا تھا: ہمارے گھر کے اور جناب ویرا سنگھے کے گھر کے سامنے جو آدھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

بھجن گانے والوں کا جلوس، بھڑک دار طریقے سے سجا ہوا چھکڑا جو بجلی کی روشنی سے منور تھا اور اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ لگتا تھا بچے بادلوں کے گھونسلے میں بیٹھے ہیں، موسیقی بذات خود۔ کیا بڑے ان چیزوں سے اتنا محظوظ ہو سکتے تھے جتنا کہ بچے؟

برآمدے میں بیٹھے کچھ لوگ گپ شپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میری توجہ ان کے درمیان بیٹھی ایک لڑکی کی طرف مبذول ہوتی چلی گئی۔ میں اسے پہلے کالج میں بھی دیکھ چکا تھا۔ کالج میں وہ حسب معمول سادہ سا فراک پہن کر آتی تھی جبکہ آج اس نے ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ میں اپنی نظریں اس پر سے نہ ہٹا سکا۔ میں اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔

لیکن میں ان نرم گالوں اور سیدھی مضبوط ناک کو دیکھنے کا خاصا عادی تھا۔ میں اسے کالج میں بار ہا دیکھ چکا تھا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ آج اس کا چہرہ اس قدر غیر معمولی حسن سے چمک رہا تھا۔

مجھے اب بیساکھ کے چراغ زیادہ آب و تاب سے جلتے نظر آرہے تھے۔ چاندنی زیادہ ملکوتی نظر آتی تھی۔ باغ میں باتیں کرتے ہوئے بچوں کی آوازیں مجھے موسیقی کی مانند محسوس ہونے لگی تھیں۔

میں کالج میں بعض اوقات اس کے ساتھ خاصی درشتگی کا مظاہرہ بھی کر چکا تھا۔ ایک بار میں نے اس کے ساتھ بڑی اپنائیت سے بھی بات کی تھی اور اس نے اسی بے تکلفانہ خوشدلی سے جواب دیے تھے۔

میں نے اس سے بات کرنے کے لیے اپنے ذہن کو ٹٹولا لیکن تمام تر کوشش کے باوجود اپنے چہرے پر صرف ایک بیوقوفانہ مسکراہٹ لا سکا۔ میں ابھی اس کے پاس جانے کے لیے ہمت جمع ہی کر رہا تھا کہ اس نے مجھے بلالیا:

''میں نے پورے دو دن سے کتاب کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے لیکن میرا خیال ہے

کہ تم ہر چیز یاد کر سکتے ہو، چاہے تم صرف کالج جاتے ہوئے اپنی کتابوں پر ایک نظر ہی ڈال لو۔''

''کالج جاتے ہوئے......؟'' میں صرف یہی کہہ سکا۔ میں نے کوشش کر کے مزید کہا: ''یہ صرف خوشامد ہے۔ اب میں اتنا بھی لائق نہیں ہوں۔''

''یہ خوشامد نہیں ہے۔ ہر کوئی کہتا ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔''

ایک پیلی کاغذی لالٹین سے چھننے والی روشنی میں اس کے کانوں کے بالے شعلوں کی طرح دمک رہے تھے اور اس کے چہرے کی چمک میں اضافہ کر رہے تھے۔

ہم نے اپنے کالج اور ہم جماعتوں کے متعلق بات چیت کرنا شروع کر دی۔ کبھی ہنستے کبھی اختلاف کرتے ہوئے اس نے مجھ سے وہ اگلوالیا جو ان کے بارے میں میرا حقیقی خیال تھا۔

''ایشا تو فلرٹ ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں اس سے شاذو نادر ہی بات کرتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''مجھ میں اس سے دوسروں کے سامنے بات کرنے کی ہمت نہیں ہے۔''

اس کے پرمسرت چہرے پر ایک بادل سا چھا گیا۔ ہماری آنکھیں ملیں۔

''تو کیا تم اس سے صرف تب بات کرتے ہو جب آس پاس اور کوئی نہ ہو؟''

سارا یقیناً فلرٹ نہیں تھی لیکن جب ہم باتیں کر رہے تھے تو وہ بعض اوقات سر کو ایک طرف جھکاتی اور کن اکھیوں سے میری طرف دیکھتی۔

''اگرچہ میں ایشا کو فلرٹ سمجھتا ہوں مگر ایسا نہیں ہے کہ میں اس وجہ سے اس سے نفرت کرتا ہوں۔ مجھے تو فلرٹ لڑکیاں پسند ہیں۔'' میں نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری اس بات کا میرے سوال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے اپنی آنکھیں مسلسل میرے چہرے پر مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ایشا سے صرف اسی وقت کیوں بات کرتے ہو جب کوئی اور آس پاس موجود نہیں ہوتا؟ اروندا، کیا یہ دوسرے لوگوں کی وجہ

سے ہے کہ تم مجھ سے بھی زیادہ بات چیت نہیں کرتے؟''

''سارا، تم فلرٹ نہیں ہو۔''

''مجھے پرواہ نہیں ہے اگر تم مجھے بھی فلرٹ سمجھو۔ مجھے جس بات کی پرواہ ہے وہ یہ ہے کہ تم مجھ سے یا ایشا سے صرف اس لیے بات نہیں کرتے کہ تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ دوسرے لوگ کیا کہیں گے۔''

کیا جس طرح میں نے اس کے سوال کا جواب دیا اس سے میری کسی خاص کمزوری کا اظہار ہوتا تھا؟ میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ کسی مرد کو اٹھائیس برس کی عمر سے پہلے اپنے رویے سے یہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ اسے عورتوں میں دلچسپی ہے۔

ایک مرتبہ جب میں تقریباً پندرہ برس کا تھا تو میں اپنی ایک کزن کے ساتھ بات چیت اور ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک نوجوان نے، جو یہ سمجھا کہ مجھے اس سے محبت ہے، میرا مذاق اڑایا اور مجھ پر ہنسا۔ اس سے مجھے شدید تکلیف پہنچی ۔ وہ لڑکی میری خالہ کی بیٹی تھی لیکن میں نے دوبارہ شاید ہی کبھی اس سے کوئی بات کی ہو۔

لڑکی سے راز داری میں محبت کرنی چاہیے۔ اگر آدمی اس سے محبت کی بات کرنے کا خواہش مند ہو تو کہیں اکیلے میں ملنا چاہیے۔ عشقیہ خط کسی تیسرے شخص کو دکھانا اعتماد کو ٹھیس پہنچانا ہے۔

''ہاں میں اس ڈر سے ایشا سے دوسرے لوگوں کی موجودگی میں بات نہیں کرتا وہ لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔ شاید کالج سے نکلنے کے بعد میں اس شرمیلے پن پر قابو پالوں۔''

میں یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ آیا وہ اس وقت صرف اس لیے ہنسی کہ اسے میری ایمانداری پسند آئی۔

''اگر تم لوگوں کے ہنسنے سے اتنے خوفزدہ ہو تو تم کبھی کسی پر عاشق نہیں ہو سکو گے......''

کیا وہ واقعی ایسا سوچتی تھی؟ یا پھر صرف اس لمحے کی ترنگ میں ایسا کہہ رہی تھی؟

''کیوں نہیں؟'' میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔ ''شرمیلا شخص عموماً اس وقت تک اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتا جب تک اسے اس کا پورا یقین نہ ہو اور ایسی محبت کبھی نہیں

بدلتی۔''

''تو کیا تمہیں پہلی نظر کی محبت پر یقین نہیں ہے؟''

''کیا میں نے آج تمہیں پہلی بار دیکھا ہے؟ میں تمہیں برسوں سے جانتا ہوں۔''

سارا نے مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔

''میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہیں محبت کرنا کسی کتاب سے سیکھنا پڑے گا۔''

بھجن گانے والوں کی منڈلی کسی بل کھاتے بادل کی طرح آ رہی تھی۔ ان کے چھکڑے پر بچوں کی ٹولیاں سوار تھیں۔ میں اس وقت خوابوں کی ایک ایسی دنیا میں تھا جو میرے لیے اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی باغ میں موجود بچوں کے لیے بھجن گانے والوں کی منڈلی۔ زمین پر اپنی مدھم شعائیں ڈالتا ہوا چاند کسی ایسے بڑے لیمپ کی مانند تھا جو کسی تخیلاتی دنیا کی آسمانی چھتری میں ٹکا دیا گیا ہو۔ بھجن گانے والوں کی منڈلی نے ہمیں رنگ و روشنی اور موسیقی اور نغمات سے خوش کر دیا۔ جونہی وہ گئے باغ میں شور مچ گیا۔ جیسے جیسے لوگوں کو کھانے اور مشروبات کی شکل نظر آئی ہر شخص باتونی ہو گیا۔

''وید جیا سنا نے یقیناً آج بہت خرچہ کیا ہوگا۔'' شریمتی سلیا نے کہا۔ لمبی سکرٹ اور جیکٹ وہ لباس تھا جو اس کی بھری ہوئی چھاتیوں اور مربع جبڑوں والے چہرے پر خوب جچتا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی قبول کرتے ہوئے میری والدہ کا شکریہ ادا کیا۔

''کچھ خاص نہیں، شریمتی اوپی سیرا، میرے والد نے جواب دیا کھانا گھر پر ہی تیار کیا گیا ہے۔ میری بیوی اور مینکا نے سارا کام خود کیا۔''

''اوہ، کچھ بھی کام نہیں تھا۔ مینکا نے میری بہت مدد کی۔'' میری والدہ نے دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

میری بہن شریمتی اوپی سیرا کے قریب بیٹھ گئی۔

''آج ابا اور اماں کے لیے بہت خاص دن ہے۔ دیکھیے اماں نے نیا لباس زیب تن کر رکھا ہے۔ یہ انہوں نے خاص طور پر اسی موقع کے لیے بنوایا ہے۔''

''تمہاری والدہ بالکل میری طرح ہیں۔'' شریمتی اوپی سرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

میری بہن نے شریمتی اوپی سیرا کے سکرٹ کا ایک کونا اٹھایا اور اس کے عمدہ ریشم کو اپنی انگلیوں سے مس کیا۔ پھر وہ اپنے آپ کو اس نازک کام والے سونے کے ہار کو تھپتھپانے سے نہ روک سکی جو اس بوڑھی خاتون کے گلے کو سجا رہا تھا۔ شریمتی اوپی سیرا فخریہ انداز میں ہنسی اور میری والدہ کو پکارا:

''تمہاری بیٹی کہہ رہی ہے کہ تم اور میں آج کی رات کے سب سے خوش لباس لوگ ہیں۔''

''اگر ہم آج کے دن بھی اچھے کپڑے نہ پہنیں تو پھر کب پہنیں گے؟''

اماں نے میری بہن کی پرانی ساڑھی کی طرف ناپسندیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''صرف بوڑھی عورتوں کو خوبصورت کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے!''

میری بہن کو دوسرے لوگوں کو نیچا دکھانے میں بالکل اسی طرح لطف آتا تھا جس طرح کسی بچے کو پرندے کو پتھر مار کر۔

میری والدہ ہنس دیں۔

''جب تم بوڑھی ہو جاؤ گی تو تم بھی سادہ کپڑے پہننا چھوڑ دو گی!''

جس جس نے بھی ان کی بات سنی وہ قہقہے لگانے لگا۔ بچوں نے بھی بہت جوش سے اپنے بڑوں کی تقلید کی۔

''مینکا اس وقت بہت سبکی محسوس کر رہی ہوگی۔'' سروجنی نے آہستگی سے کہا۔

''بالکل نہیں۔ وہ ایسی باتوں پر کان ہی نہیں دھرتی۔ وہ اس وقت صرف اس لیے خاموش ہے کہ وہ اماں کو مزید ناراض نہیں کرنا چاہتی۔''

''ہم جو کچھ آج یہاں کر رہے ہیں وہ تعریف کے قابل ہے۔'' مینکا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے تو یہ سب کچھ صرف اس لیے کیا کہ ایسا کرنا مجھے پسند ہے۔'' اماں نے کہا۔

دو تین بچوں نے تالیاں بجائیں۔

''خوشی اور اعزاز دونوں کے لیے۔'' میرے والد نے کہا۔

''سارا، تم سینئر امتحان پاس کرنے کے بعد کیا پڑھوگی؟'' وہ برآمدے کے کونے میں اپنے اوپر لٹکی ہوئی بیساکھ کی لالٹین سے آنے والی روشنی سے پرے ہٹ گئی۔

''مجھے سینئر امتحان میں پاس ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔''

''سارا تم بہت اچھے طریقے سے پاس ہو جاؤ گی۔ اچھا اگر تم پاس ہو گئی تو......''

''تب میں پڑھائی ختم کردوں گی۔ لوگ ملازمت کے حصول کے لیے ہی زیادہ پڑھتے ہیں۔''

''کیا تمہارے والد بھی نہیں چاہتے کہ تم تعلیم جاری رکھو؟''

''نہیں۔ میرے والد کو اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ میں پڑھوں یا نہ پڑھوں۔ والدہ کبھی کبھار اس سلسلے میں پوچھ لیتی ہیں۔ وہ ڈاکٹروں اور وکیلوں سے تعلق قائم کرنے کے انتظار میں ہیں......''

''لیکن اگر تمہیں نوکری کرنا پسند نہیں ہے تو تم نرس کیوں بننا چاہتی ہو؟''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ میں نرس بننا چاہتی ہوں۔'' اس نے قدرے چڑچڑے پن سے کہا۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ بیماروں کی دیکھ بھال کس طرح کی جاتی ہے تاکہ اگر گھر میں کوئی بیمار پڑے تو اس کی مدد کرسکوں۔ اب ابا کو دیکھو۔ وہ اپنی تمام صلاحیت پیسہ بنانے میں صرف کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہیں اچانک بیمار نہ پڑ جائیں۔''

''تمہارے والد تو پہلے ہی ایک امیر کبیر تاجر ہیں۔ انہیں مزید دولت کمانے کی اتنی خواہش کیوں ہے؟''

''میرا خیال ہے ان کو دولت کمانے میں لطف آتا ہے۔''

''نہیں نہیں!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''وہ اب تمہارے جہیز کے لیے دولت کے انبار لگا رہے ہیں!''

''میں جہیز نہیں لینا چاہتی!''

''لیکن تم جہیز کے بغیر کسی ڈاکٹر یا وکیل سے شادی نہیں کرسکوگی۔'' میں نے اس کے چہرے پر بھرپور نظریں جماتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھ سے آنکھیں چار نہ کیں۔ ''میں تو اسی سے شادی کروں گی جو مجھے پسند ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے بھی میرے والد وکیلوں اور ڈاکٹروں کے خواہش مند نہیں ہیں۔ یہ تو صرف میری والدہ کی خواہش ہے۔''

''اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ وہ ہر وقت تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں۔''

''گو ابا ہر وقت میری باتیں نہیں کر رہے ہوتے میں جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور اگرچہ وہ پیسہ کماتے ہیں لیکن وہ بخیل نہیں ہیں۔ واقعی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ صبح سے لے کر شام تک کاروبار کے ہو کر کیوں رہ جاتے ہیں۔''

پنساری کی بیوی کے اچانک قہقہے نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ہم سے زیادہ دور نہیں کھڑی تھی۔ کیا وہ اس لیے ہنس رہی تھی کہ اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں؟

''میں حیران ہوں کہ شریمتی مودالالی کس پر ہنس رہی ہیں؟'' میں نے قدرے شرمساری سے کہا۔

''اس کا ہم سے کیا تعلق؟'' اس نے کہا

''لیکن سارا، کیا تم نے ایک لمحہ پہلے یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارے والد کو پیسہ بنانے میں لطف آتا ہے؟''

''ہاں، مجھے یاد ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ ایسا کیسے محسوس کر سکتے ہیں۔''

''جس شخص کو پیسہ بنانے سے محبت ہے اسے یقیناً پیسے سے بھی محبت ہوگی!''

''پھر وہ کنجوس کیوں نہیں ہیں؟ وہ ہمارے لیے چیزیں خریدتے ہوئے کبھی کمی نہیں کرتے۔ وہ اپنے مہمانوں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے آپ پیسے سے کئی طریقوں سے محبت کر سکتے ہیں۔ یہ کچھ لوگوں کو کنجوس بنا دیتا ہے اور کچھ لوگ پیسہ بنانے...... یا اسے خرچنے...... میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ کنجوس آدمی کو پیسہ بنانے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ وہ تو صرف پیسے کو

بڑھتے چلے جانے کا موقع مہیا کرتا ہے۔ لیکن جس شخص کو خرچنا پسند ہو اسے خود پیسہ اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔''

''تمہارے حساب سے تو دونوں ہی کنجوس ہوئے!'' سارا نے شرارت سے کہا۔

زیادہ تر مہمان جا چکے تھے۔ پنساری کی بیوی سب سے آخر میں گئی۔ اس نے ابھی ابھی میرے والدین کا شکریہ ادا کیا تھا اور میری بہن کا الوداعی بوسہ لے رہی تھی۔

تمام رنگین لالٹینیں، جن کی موم بتیاں جل جل کر ختم ہو چکی تھیں، بجھ چکی تھیں۔ صرف جنگلے کے کونے میں ایک لالٹین جل بجھ رہی تھی۔ سائے لمبے ہو چکے تھے لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ چاندنی اب زیادہ روشن تھی: باغ چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ ہم مندر میں پھول چڑھا کر واپس آتے ہوئے لوگوں کے قہقہے اور آوازیں سن رہے تھے۔ ان کو گھر جاتا دیکھ کر سارا کو بھی یاد آ گیا کہ واپس جانے کا وقت ہو چکا ہے۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سارا، ٹھہرو۔ تمہیں ابھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے التجا کی۔

''اماں ڈانٹیں گی۔ انہیں میرا یہاں آنا زیادہ پسند نہیں ہے۔''

چوتھا باب

قریب دو ہفتے سے متواتر بارش ہو رہی تھی۔ میں اس عرصے میں ابا کی بیل گاڑی میں کالج جاتا رہا۔

ایک دن ایسا طوفان آیا کہ بہت سے درخت ٹوٹ کر زمین پر آگرے۔ بلا رکے آدھے گھنٹے بارش ہوتی رہی اسے بارش نہیں کہا جا سکتا تھا، یہ آسمان سے گرتی ہوئی سمندر کی طوفانی موجیں تھیں۔ سڑک بڑی تیزی اور شدت سے بہتی ہوئی کوئی پانی کی رو معلوم ہو رہی تھی جبکہ اس سے پرے کھیت کیچڑ کا سمندر۔

طوفان کے آدھے گھنٹے بعد بارش بظاہر تھم گئی اور میں کالج جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ابا چاہتے تھے کہ میں گھر پر ہی رہوں۔

''مالس اس بارش میں بیل گاڑی باہر نہیں لے کر جائے گا۔ گرے ہوئے درختوں سے راستہ بند ہوگا۔''

لیکن میں باہر نکل کر یہی تو دیکھنا چاہتا تھا۔ میری باضمیری کی اصل وجہ یہی تھی۔ میں خود دیکھنا چاہتا تھا کہ تیز آندھی نے کتنا نقصان پہنچایا ہے۔

''کالج اب اتنا بھی دور نہیں ہے۔'' میں نے کہا

''آج تو وہ کالج کھولیں گے بھی نہیں۔''

پندرہ منٹ بعد ابا بیل گاڑی میں کسی مریض کو دیکھنے جا رہے تھے۔

''جب تم کالج جانا چاہتے تھے تو راستہ بند تھا۔ اب تمہارے والد کسی طرح باہر جا رہے ہیں؟'' اماں ابا سے براہ راست یہ نہیں پوچھنا چاہتی تھیں اس لیے یہ سوال انہوں نے

مجھ سے کیا۔

''نہیں ، بیگم صاحبہ۔'' جو دکاندار ابا کو لینے آیا تھا اس نے کہا۔''راستہ بند نہیں ہے۔ پانی سے ادھر ادھر کچرے کے کچھ ڈھیر رہ گئے ہیں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

ابا کے جاتے ہی سورج بادلوں میں سے راستہ بناتا ہوا نکل آیا تاکہ گیلی تیرگی کو روشن کر سکے۔

''بیٹے، ذرا اس مرغی کو دیکھو!'' اماں نے ایک گیلی، مٹی سے لتھڑی ہوئی مرغی کو جو مٹی میں ٹھونگیں مارتی ادھر ادھر پھر رہی تھی دیکھ کر کہا۔

میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ مرغی مینکا سے بہت مشابہت رکھتی تھی جو اسی وقت ہمارے دروازے کے سامنے رکی ہوئی بیل گاڑی سے اتر رہی تھی۔ ایک گیلے چیتھڑے جیسی ساڑی گیلے پروں کی طرح اس کے سوکھے جسم سے، جو مجھے اکثر چاقو کے پھل کی طرح لگتا تھا، چپکی ہوئی تھی۔ اس کے بولنے کا انداز، چال ڈھال، شکل وصورت سب لڑاکا مرغی جیسے تھے۔

وہ کافی غصے میں تھی۔ جیسے ہی اس نے سری مل کو گاڑی سے اتارا وہ بھاگتا ہوا اپنی نانی کے پاس گیا اور ان کے گھٹنوں سے چمٹ گیا۔ اماں نے اسے چومنے کے لیے اوپر اٹھایا اور پھر کھڑا کر دیا۔

''تو آپ اس طرح بیل گاڑی بھیجتی ہیں مجھے لانے کے لیے حالانکہ میں تین مرتبہ منگوا چکی تھی۔'' مینکا نے ایک سڑا ہوا پپیتا ڈرائنگ روم کی گول میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اتنی تیز بارش میں بیل گاڑی کیسے بھجواتی؟'' اماں نے غصے سے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔''گاڑی بان جانور نہیں ہے۔ وہ بھی انسان ہے۔''

''مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مالس جانور نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ چاہتیں تو بارش رکتے ہی میرے لیے بیل گاڑی بھیج سکتی تھیں۔''

''بارش کب رکی ہے؟'' اماں نے پہلے سے بھی زیادہ غصے سے کہا۔''کیا بارش کو تھمے صرف چند منٹ نہیں ہوئے؟''

مینکا بھیگی بلی بنی باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مکاری

سے ہنسی۔

''میرے لیے بھی کھانا پکانا مت بھولنا!'' اس نے باورچی سے کہا۔

''بے شرم عورت۔'' اماں نے اپنے آپ سے کہا۔''یہ تو اس بچے کو بھی ٹھیک سے کپڑے نہیں پہناتی۔'' انھوں نے سری مل کے فراک کو انگلیوں سے چھوا۔ کتنا گھٹیا کپڑا ہے!''

دھرم داس ایک دفتر میں کام کرتا تھا۔ جب وہ صبح کے وقت دفتر چلا جاتا تو مینکا، اس کا باورچی اور ایک لڑکا گھر پر رہ جاتے۔ ہفتے میں کم از کم دو یا تین مرتبہ مینکا دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھانے آجاتی تھی۔ جب دھرم داس کا کام سے آنے کا وقت ہوتا تو وہ ابا کی بیل گاڑی میں اپنے گھر چلی جاتی۔ اگر ہماری بیل گاڑی دستیاب نہ ہوتی تو اس وقت وہ کرائے کی بیل گاڑی لینے کے متعلق سوچتی۔ ''میں گھر میں اکیلی بیٹھی بور ہو جاتی ہوں۔'' وہ داخل ہوتے ہی کہتی۔ لیکن اماں کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کنجوسی کی وجہ سے ہمارے گھر آتی تھی۔ دھرم داس کی تنخواہ خاصی کم تھی۔ دھان کا کھیت اور زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعے جو اسے اپنے والدین سے ورثے میں ملے تھے ان سے بھی اس کی آمدنی برائے نام ہی تھی۔ اس نے اس طرح کا بندوبست کیا ہوا تھا کہ یہ آمدنی سیدھی مینکا کے ہاتھوں میں جاتی۔ وہی اس بات کا دھیان رکھتی تھی کہ ناریل اتار لیے گئے ہیں اور دھان کی کٹائی ہو گئی ہے یا نہیں۔

''بیگم صاحبہ، وہ مجھے بالکل چین نہیں لینے دیتیں۔'' کیرولس نے ایک دن اپنی ہنسی دباتے ہوئے شکایت کی۔ ''اگر ہم ہر بار اتنے ہی ناریل لا کر نہ دیں تو وہ مجھ پر چڑھ دوڑتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں لوگوں کو ناریل چرانے دیتا ہوں۔ ہر دفعہ پھل ایک جتنا کیسے ہوسکتا ہے؟''

''اگر تم اپنا کام صحیح طرح کر رہے ہوتے تو وہ شکایت نہ کرتی!''

''بیگم صاحبہ نہیں۔ میں تو کسی کو آندھی سے ٹوٹی ہوئی ٹہنی بھی نہیں اٹھانے دیتا۔ میری بیوی کہتی ہے کہ مینکا بی بی صحیح کنجوس ہیں۔''

''کیرولس، تھوڑا کنجوس ہوئے بغیر تو تم وہ بھی نہیں بچا سکتے جو تمہارے پاس

ہیں۔ مینکا بی بی جانتی ہے کہ تم ہمیں کبھی دھوکا نہیں دو گے۔''

وہ ہنسیں لیکن غصے کی ایک چنگاری ان کی آنکھوں میں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں کہ مینکا کے رویے کی وجہ سے لوگ ہماری عزت کرنا چھوڑ دیں گے۔

کیرولس کچھ بے کل ہوگیا۔

''بیگم صاحبہ، برائے مہربانی آپ یہ نہ خیال کریں کہ میں ان کی شکایت کر رہا ہوں۔ ان کا سلوک ہمارے ساتھ بہت اچھا ہے اور وہ مغرور بھی نہیں ہیں۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ وہ تھوڑی سی......''

اس کی نظریں اماں سے چار ہوئیں اور اس اچانک ان کی آنکھوں میں غصہ اترتے دیکھا۔ وہ بیچارا بے حس وحرکت کھڑا ہوگیا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو وہ اپنے الفاظ واپس لے لیتا۔

''......کنجوس ہے!'' اماں نے کہا اور ہنس دیں۔ کیرولس نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ مینکا ہر ہفتے ہمارے گھر سے سات آٹھ ناریل لے جاتی تھی۔ اماں اپنی ناراضگی کا اظہار کرتیں لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

''کیوں؟ یہ میرا حصہ ہے۔''

''تمہارا حصہ؟'' اماں خاصی ناراض ہوتیں۔ ''تمہارا حصہ تو تمہارا جہیز تھا......تم بڑی چڑیل ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دیتیں۔

''ہاں، چڑیلوں کو بھی تو زندہ رہنا ہوتا ہے۔'' مینکا ہار کر افسردگی سے اپنا سر جھکا دیتی۔

بعض اوقات اماں مینکا کی کنجوسی پر صرف ہنس دیتیں گو ایسے موقعے بھی ہوتے جب وہ اسے اس پر ڈانٹتیں۔ میرا خیال ہے کہ کبھی کبھار وہ خفیہ طور پر مینکا کے کردار کے اس رخ کی تعریف بھی کرتی تھیں۔

ہمارے گھر آنے سے پہلے مینکا اپنے باورچی کو پاؤ بھر چاول اور نمک لگی مچھلی کا ایک ٹکڑا دیتی۔ پھر باورچی خانے کو تالا لگاتے ہوئے کہتی: ''اگر تم دونوں چاہو تو اپنے لیے

ناریل کی کھیر بھی بنا سکتے ہو۔''

باورچی نے ایک دن یہ سب کچھ اماں کو بتا دیا۔ جب اگلی مرتبہ مینکا ہم سے ملنے آئی تو اماں نے اسے اس بات پر جھڑکا:

''کیا تمہیں اس بات کا پتا نہیں کہ ان ملازموں کو بھی کھانا ہوتا جو تمہاری خدمت کرتے ہیں؟ تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ وہ صرف چاول اور نمک لگی مچھلی پر زندہ رہ سکتے ہیں؟ اور تم انہیں زیادہ چاول کیوں نہیں دیتی؟ کم از کم وہ اپنا پیٹ تو بھر لیا کریں!''

''وہ سبزیاں نہیں کھاتے۔'' مینکا نے بڑی مٹھاس اور نرمی سے کہا۔''انہیں سبزیاں پسند نہیں ہیں۔''

اماں نے اپنی آواز دھیمی کر لی، جیسے وہ اپنے غصے پر شرمندہ ہوں۔''دو ملازم پاؤ بھر چاولوں پر کس طرح گزارہ کر سکتے ہیں؟''

''میرے اور دھرم داس کے لیے تو یہ ضرورت سے زیادہ ہوتے ہیں۔''

یہ کنجوسی اس نے کہاں سے اور کس سے سیکھی تھی؟

''جو لوگ اتنی زیادہ محنت کرتے ہیں انہیں وافر خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاؤ بھر چاولوں سے تو ہمارے باورچی کا بھی پیٹ نہیں بھرتا اور مالس کو کم از کم سیر بھر چاولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''مالس تو جوان آدمی ہے جبکہ باندا تو ابھی چھوٹا سا لڑکا ہے''

''جو لڑکے بہت سا کام کرتے ہیں وہ بہت سا کھاتے بھی ہیں۔''

''میں اس سے اتنا زیادہ کام نہیں لیتی۔ وہ صرف صبح کے وقت گھر میں جھاڑو دیتا ہے اور بازار سے سودا سلف لاتا ہے۔''

اماں نے ہار مان لی۔ انہوں نے ہنستے ہوئے صرف اتنا کہا:''تمہیں انہیں کھانے کے لیے زیادہ دینا چاہیے۔''

بارش سے بچنے کے لیے درختوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے کووں کی فاقہ زدہ کائیں کائیں نے مجھے قدرے غمزدہ کر دیا۔ کھیت عام طور پر زندگی سے بھرپور ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی مکھیوں کے بادل جو چرتے ہوئے مویشیوں کی دموں سے حرکت میں آجاتے،

اڑتے ہوئے سارسوں کی سفید چمک، کیڑوں کا شکار کرتی ہوئی مینائیں اور کھیتوں میں مٹی کے تودے پلٹاتے ہوئے ہوئے مرد۔ یہ سب کچھ اب پانی اور کیچڑ کا بے حرکت انبار تھا۔

بارش نے جونکوں کو بھی باہر نکال دیا تھا۔ وہ جامن کے درخت کے نیچے مردہ پتوں کے درمیان ہوا کی تلاش میں ادھر ادھر پھر رہی تھیں اور چمڑے کے متحرک ٹکڑوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔ اماں نے جھاڑو پکڑی اور انہیں صاف کرنا شروع کر دیا۔

''مجھے دیجئے۔'' مینکا نے کہا۔ اس نے جھاڑو اماں سے چھین لی، باغ میں پھیری اور جامن کے درخت کے نیچے سے تمام مردہ پتوں اور گند کو ایک ڈھیر کی صورت میں جمع کیا۔ یہ سارا کام اس نے ایک ساتھ کیا۔

''مالس، تم اس ڈھیر کو فوراً آگ لگا سکتے ہو؟''

''بی بی! کتنے گناہ کی بات ہے۔ جونکیں جل کر مر جائیں گی۔'' اس نے کہا۔

''بکواس! وہاں کوئی جونک نہیں ہے۔'' مینکا نے واپس برآمدے میں آتے ہوئے کہا۔ ایک لمحے بعد ہو تھوڑا سا نمک لینے گئی اور اسے اپنے پیروں کے درمیان ڈال دیا۔ اس کے پاؤں سے ایک جونک خون میں تر بتر کسی چھوٹی گیند کی طرح لڑھکی۔

''وہاں صرف ایک یا دو جونکیں تھیں۔ یہ ان میں سے ایک تھی۔ دوسری کہیں چلی گئی۔ یہ تو ایسے دکھائی دیتی ہیں جیسے کسی چیز کی پیمائش کر رہی ہیں!''

''یہ یقیناً باغ کا سروے کرنے والے دوسرے جنم میں جونکیں بن جاتے ہیں! مینکا ہنسی۔

آسمان دوبارہ تاریک ہو گیا۔ طوفان کی کڑک نے مینکا کو بے چینی سے ابا کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس بیمار کو دیکھنے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی تھی؟

اماں سری مل کو اٹھا کر میز پر لے گئیں اور اسے کچھ چاول کھلائے۔

اماں کبھی کسی ایسے شخص کو خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو معاف نہیں کرتی تھیں جس نے انہیں یا ان کے خاندان کو کوئی نقصان پہنچایا ہو۔ اگر ان کا ایسے لوگوں سے اتفاقاً آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتیں اور اگر وہ اس قسم کے سلوک پر ہتک محسوس کرتے تو وہ جی بھر کر خوش ہوتیں۔ جب مینکا اور دھرم داس کے رشتے کی بات

چل رہی تھی تو ان کے ایک کزن کی بیوی نے دھرم داس کے باپ کو مینکا کے عیبوں اور ابا کی غربت کے متعلق ایک لمبا قصہ سنایا تھا۔ اس نے انہیں بتایا تھا کہ دھرم داس سے پہلے مینکا سے شادی کرنے کے خواہش مند دو لڑکوں نے، جو ابتدائی ملاقات کرنے بھی آ چکے تھے، اس کی تیز زبان اور اس سے بھی زیادہ کٹیلے طریقوں کے متعلق سن کر بات چیت منقطع کر دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مینکا اور اماں اتنا لڑتی ہیں کہ ایک دوسرے کے بال پکڑ کر کھینچتی ہیں بلکہ مینکا نے تو ایک مرتبہ اماں کے بازو پر اتنے زور سے کاٹا تھا کہ خون نکل آیا تھا۔

جب اماں نے ان بہتانوں کے متعلق سنا تو انہوں نے قسم کھائی کہ وہ اس عورت کے خاندان کی شادی یا مرگ پر نہیں جائیں گی۔ بہر حال مینکا نے کچھ عرصے بعد اس خاندان سے دوبارہ تعلقات استوار کر لیے۔ اماں اکثر اسے ایسے لوگوں سے تعلقات رکھنے پر جھڑکا کرتی تھیں جن سے خود ان کی لڑائی ہو چکی تھی۔

''آپ کسی رشتے دار سے علیحدہ نہیں ہو سکتے خواہ اس نے کچھ بھی کیا ہو۔'' مینکا بحث کرتی۔

اگر مینکا نہ تھکنے والی مشین کی طرح تھی تو کنجوسی اس کی بنیادی قوت تھی۔ لیکن وہ حسد اور کینے سے پاک تھی اور بہتان نہیں لگاتی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ اس شخص کو کبھی معاف نہیں کرتی تھی جس نے اسے دھوکا دیا ہو۔ تنقید اسے کبھی پریشان نہیں کرتی تھی۔ اس سے کہے گئے سخت الفاظ اسی طرح تھے جیسے چکنے گھڑے پر بوندیں۔ اس کے عجیب وغریب کردار نے انسانی شخصیت کے بارے میں میرے تمام خیالات کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس کے اندر رحم یا ہمدردی کی فراوانی کبھی نہیں ہوتی تھی لیکن وہ اتنی کائیاں ضرور تھی کہ جب بھی اس کا فائدہ ہوتا تو وہ اپنی بہتر جبلتوں کے آگے ہار مان لیتی۔

''ابا ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟'' وہ پوچھنے کے لیے میرے پیچھے آئی۔ اس کے انداز سے ابا کے متعلق ایک پوشیدہ بے چینی کا پتا چلتا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ بارش والے بادل آسمان کے ہر کونے سے جمع ہو رہے تھے۔ تاریکی بڑھتی گئی۔ کیا مینکا کی بے چینی صرف بڑھتی ہوئی تاریکی اور وقفے وقفے سے آنے والے طوفان کی وجہ سے تھی یا پھر اس کی

وجہ ابا کے متعلق پریشان کن خیالات تھے۔

رات کی تاریکی اپنے ساتھ دماغ میں خاموشی، لمبے لمبے آرام دہ سانس اور پرسکون خیالات لاتی ہے۔ لیکن اگر ان کے وقت ایسی تاریکی چھا جائے تو یہ فطرت کی تباہ کن قوت کا دہشت انگیز نشان بن جاتی ہے۔

ہماری جسمانی زندگی کا ابتدائی شعلہ خود زمین ہی کی طرح قبل تاریخ کے سیلاب اور آگ کے درمیانی وقفے میں پیدا ہوا تھا۔ ہم کسی مصیبت کو پہچاننے سے پہلے اسے محسوس کر لیتے ہیں کیونکہ جسم دماغ سے مقدم ہوتا ہے۔ کیا مینکا کی پریشانی کی وجہ ایسی ہی پیش آگاہی تھی؟ طوفانی بجلی کی کڑک کے درمیان تاریکی میں سے آتی ہوئی بیل گاڑی کی آواز سنائی دینے لگی۔ مینکا نے جامن کے درخت کے نیچے پناہ لے لی اور غور سے سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ بیل گاڑی کے اندر دیکھنا مشکل تھا کیونکہ اس کے کرمچ کے پردے بارش کی وجہ سے گرے ہوئے تھے۔

''وہ ابا کی بیل گاڑی میں کسی مریض کو یہاں لا رہے ہیں۔'' مینکا نے کہا۔

اس نے اپنی آنکھیں پوری توجہ سے بیل گاڑی پر جمائے رکھیں۔ ''اماں!'' وہ یک دم چلائی۔ بیل گاڑی میں موجود اپاہج شخص جسے دو آدمیوں نے سہارا دے رکھا تھا خود ابا تھے۔

''بیٹی۔'' اماں بھی باہر دوڑیں۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بین کرنے سے روکا۔ ہم نے ابا کو اٹھا کر ان کے کمرے میں لانے میں ان دو آدمیوں کی مدد کی جو ان کے ساتھ آئے تھے۔

''انہیں ایک منٹ کے لیے صوفے پر لٹا دو۔'' مینکا دوڑی دوڑی الماری کی طرف گئی اور نئی چادریں اور تکیوں کے غلاف نکال لائی، اور ایک لمحے میں بستر تیار کر دیا۔

پانچواں باب

اگلے دن صبح ہونے سے پہلے ہی مینکا اور اس کا خاوند ہمارے دروازے پر تھے۔ اس نے خاموشی سے میری طرف دیکھا اور اس کی تشویش نے میرے نا رضامند ہونٹوں سے الفاظ اگلوا لیے۔ میں صرف اتنا کہہ سکا: ''ان کا حال کل جیسا ہی ہے۔''

اماں ، مینکا اور دھرم داس ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہوئے الم زدہ چہروں کے ساتھ ابا کے کمرے سے باہر آئے۔ میں نے ان کی باتیں سننے کی کوشش نہ کی اور خود ابا کے کمرے میں چلا گیا۔

وہ اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ ان کا بازو چادر پر پڑے ہوئے کسی لکڑی کے لٹھے کی مانند نظر آتا تھا۔ ان کی بائیں ٹانگ لال دھاریوں والی لنگی کے نیچے بے جان، ان کا چہرہ خاکستری اور ان کا منہ ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ ان کو اس طرح دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔ غالباً وہ خوش دکھائی دینے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ ان کے منہ کا ایک کونا تھوڑا سا اکڑا ہوا تھا۔ اس ادھوری ہنسی کی وجہ سے ان کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ قابل رحم نظر آتا تھا۔ ان کے بے جان لب ہلے۔ میں اپنا کان ان کے منہ کے پاس لے گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ ان کے منہ سے آنے والی ٹوٹی پھوٹی آوازیں مجھ سے یہ پوچھنے کی دردناک کوشش ہیں کہ تمہارا امتحان کب ہے؟

''اب سے چار ماہ بعد۔''

چادوروں اور تکیوں کے غلافوں کی شاندار سفیدی کی وجہ سے ابا کا چہرہ حیرت انگیز طور پر روشن نظر آ رہا تھا۔ کل تک وہ نوجوان جیسے خوش باش تھے لیکن اب صرف ایک ہی دن

میں ان کی حالت کسی مردے سے بھی کچھ ہی بہتر تھی۔ اتنے عرصے میں یہ کیسے ہو گیا؟ مینکا نے پرانے جانے پہچانے کمرے کو صاف کرنے کے عمل میں اسے مکمل طور پر تبدیل کر دیا تھا۔ اب کونے میں چھوٹی میز پر ایک گھڑی ٹک ٹک کرتی تھی۔ سارا کمرہ کسی غیر متوقع مستعدی کا تاثر دے رہا تھا جیسے اس خلاف معمول آواز سے جاگ گیا ہو۔

اماں اور مینکا ابا کے کمرے کے باہر انتہائی آہستگی سے بات چیت کرتیں۔ یہ عادت ملازموں نے بھی اپنا لی۔ کھانے کے وقت پلیٹوں، چھری کانٹوں اور کرسیوں کی کھڑا کھڑاہٹ بھی نہ ہوتی۔ حتیٰ کہ گھر کے ارد گرد کتے کی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔

وید امر سنگھے دن میں دو مرتبہ آتے تھے۔ مینکا نے یہ دیکھنے کی ذمہ داری خود سنبھال لی کہ ان کی ہدایات پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ خواہ وہ کچھ بھی کیوں نہ کر رہی ہوتی اسے اس بات سے آگاہ کرنے کے لیے کہ ابا کی دوائی کا وقت ہو گیا ہے کسی گھڑی کی ضرورت نہ ہوتی۔ ساری رات جاگنے کے علاوہ صبح سے لے کر رات تک مسلسل کام کرتے ہوئے وہ ان تھک نظر آتی۔ ہر سہ پہر دو اور تین بجے کے درمیان وہ آدھے گھنٹے کا قیلولہ کر لیتی۔ یہ ہر مرتبہ آدھے گھنٹے کا ہی ہوتا۔ نہ پانچ منٹ زیادہ نہ پانچ منٹ کم۔ اسے رات کو بھی تین یا چار گھنٹے سے زیادہ سونے کا موقع نہ ملتا۔

اس کے لاغر جسم میں اتنی طاقت کس طرح چھپی ہوئی تھی؟ دھرم داس نے بے غرضانہ طور پر اسے دو ہفتوں تک اپنی مرضی کرنے دی۔ پھر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے غصے سے شکایت کی۔ مینکا نے اس کی بات ہنسی میں اڑا دی، اسے ٹھنڈا کیا اور اس سے تیمار داری میں مدد کروائی۔ اس کے بعد سے دھرم داس رات ہمارے گھر ہی گزارتا۔ میں اس مہارت پر حیران تھا جس سے مینکا نے اس سارے معاملے کو سنبھالا۔ وہ دھرم داس کو اپنے گھر پر ہونے کا احساس دلانے کے لیے اس سے خوشی سے گپ شپ لگاتی، لیکن اس انہماک سے تیمارداری کرتے وقت جس سے اس نے ابا، اماں اور مجھے اپنا قائل کر لیا تھا اس کا چہرہ مکمل طور پر غمزدہ ہوتا۔ اماں اور میں اس کا اتنا خیال کرنے لگے کہ ہم اس سے مشورہ کیے بغیر کوئی بھی کام نہ کر سکتے۔

سری داس اور سارا اتفاق سے ایک ہی دن ابا کو دیکھنے آئے۔ سری داس نے

تقریباً پانچ برس پہلے کالج کو خیر باد کہا تھا۔ اب وہ ایک اچھے متناسب جسم اور بھرے ہوئے چہرے والا نوجوان تھا جو ذرا سی بات پر دل کھول کر ہنستا، شاذو نادر ہی غصے میں آتا اور ہر وقت رونے کی حد تک غمخواری کے لیے تیار رہتا۔

ابا کو بے بس اور لاچار پاؤں پھیلائے ہوئے لیٹے دیکھ کر اس نے جتنا مجھے بتایا اس سے کہیں زیادہ محسوس کیا۔ اس نے ناامیدی جیسی کوئی چیز محسوس کی۔ ''چچا جسمانی اور دماغی دونوں لحاظ سے کسی نوجوان کی طرح چاق و چوبند ہوا کرتے تھے۔ وہ صرف دو یا تین دن میں اتنے زیادہ بے بس کس طرح ہو سکتے ہیں؟''

''اگر مینکا یہاں نہ ہوتی تو یہ تمہاری والدہ کے لیے بہت بھاری بوجھ ہوتا۔'' اس نے مینکا کو دوڑ دھوپ کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''ہمارا خیال تھا کہ تم اس دن ہی یہاں ہو گے جس دن ابا بیمار ہوئے تھے۔'' مینکا نے کہا۔

''مجھے صرف کل ہی تو ان کی بیماری کے بارے میں پتا چلا ہے۔ لیکن میرا یہ خیال نہیں تھا کہ ان کی حالت اتنی تشویشناک ہوگی۔''

''راتوں کو جاگنا دشوار ہوتا ہے۔ اور یہ اس قسم کی بیماری نہیں ہے جو جلد ٹھیک ہو جائے۔ اماں بھی اب اتنا نہیں کر سکتیں جتنا وہ کر لیتی تھیں۔''

''جب وہ ذرا بہتر ہو جائیں گے تو پھر تمہیں راتوں کو جاگنا نہیں پڑے گا۔''

''مجھے افسوس ہے کہ ان کی حالت دن بدن بگڑ رہی ہے۔ تمہیں ان کے ساتھ تین یا چار راتیں گزار کر ہماری مدد کرنی چاہیے۔''

''تین یا چار؟ اگر ضرورت پڑی تو دس بھی!'' اسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

''اتنا زور سے مت ہنسو!'' مینکا نے اسے جھڑکا۔ ''اگر ابا نے تمہاری ہنسی سن لی تو وہ ناراض ہوں گے۔ اور اگر وہ سوئے ہوئے تھے تو شاید تم نے انہیں جگا دیا ہو۔''

''میں بھول گیا تھا۔''

''تم اب بچے نہیں ہو۔ اب تم جوان آدمی ہو۔'' مینکا نے اس کی مونچھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کالج چھوڑے کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟''

''تقریباً پانچ برس۔''

''تب تو تم یقیناً پچیس برس کے ہو گے۔''

''جب عورتیں پاس ہوں تو ہمیں اپنی اصلی عمر سے کم ہونے کا تاثر دینا چاہیے۔'' اس نے سارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی ہتھیلی سے ایک اور قہقہے کو روکا۔ اس کے کندھے دبی ہوئی ہنسی سے ہلے۔

''یہاں پر تو میں واحد عورت ہوں۔ اماں ابا کے کمرے میں ہیں۔''

''کیوں، سروجنی کے متعلق کیا خیال ہے؟'' اس نے اشتیاق سے سارا کی طرف دیکھا جس نے نیچے دیکھنا شروع کر دیا جیسے وہ اپنے چہرے کی بجائے اپنے موٹے اور کالے بالوں والا خوبصورت سر دکھانے کو ترجیح دیتی ہو۔

''سارا تو ابھی تک لڑکی ہے۔ وہ عورت نہیں ہے۔''

''یہ بہت عرصہ پہلے کی بات تھی۔ اب تو یہ ٹھیک ٹھاک جوان عورت ہے۔''

سری داس نے اپنے ماتھے کو سکیڑتے ہوئے اس کے چہرے کا مطالعہ کیا جیسے وہ اسے بھانپ رہا ہو۔

''سارا، یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تمہیں ساڑی میں دیکھا ہے۔''

وہ کتنی مختلف نظر آرہی تھی، صرف اس لیے کہ اس نے اپنے بال باندھے ہوئے تھے اور کالج کے لباس کے بجائے ساڑی پہن رکھی تھی! بلاشبہ یہی وہ فرق تھا جس کی وجہ سے سری داس نے کہا: ''اب تو یہ ٹھیک ٹھاک جوان عورت ہے۔'' بھجن گانے والوں کے جلوس والی رات بھی، جب وہ پوری طرح میرے ذہن پر سوار تھی، اس نے ساڑی پہن رکھی تھی۔

مینکا نے بھی اس کی طرف ایک نئی دلچسپی سے دیکھا۔ اب ہم سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''تمہارے ابا کی دوائی کا وقت ہو گیا ہوگا۔'' سارا نے کہا۔

''نہیں ابھی نہیں۔'' مینکا نے شوخی سے کہا۔ ''تم ہم سے بچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ سری داس، اس کی ساڑی کو اس طرح مت گھورو!''

''تم انہیں دوا کب دو گی؟''

''چھ بجے۔''

''اچھا پھر میں دیکھتی ہوں وقت ہو گیا ہے یا نہیں۔'' سارا ابا کے کمرے میں چلی گئی۔

''فکر مت کرو۔ مجھے پتا ہے کہ کیا وقت ہوا ہے!''

سری داس اپنے کالج کے دنوں میں لڑکیوں کا بہت پسندیدہ تھا۔ اس کی مزیدار گفتگو انہیں بہت پرکشش لگتی۔ وہ لڑکیوں کے معاملے میں مجھ سے بالکل مختلف تھا۔

سری داس اٹھا اور اندر چلا گیا۔ وہ ٹہلتا ہوا میرے کمرے میں آ گیا اور میری ایک کتاب کے صفحے پلٹنا شروع کر دیے۔ میں بھی اندر چلا گیا اور کھڑکی کھول دی۔ کمرہ روشن ہو گیا اور ہوا اپنے ساتھ تازہ پتوں کی مہک لائی۔ کھڑکی کے قریب ہی کیلے کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا اور پتے کسی بڑے پرندے کی دم کی طرح ہل رہے تھے۔

''اروندا، کیا تمہارا امتحان قریب ہے؟''

''ہاں صرف چار مہینے رہ گئے ہیں۔ ابا کی بیماری نے مشکل پیدا کر دی ہے۔ میرا پڑھنے کو بالکل دل نہیں چاہتا۔''

''اروندا، تمہیں اتنی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ مینکا اور تمہاری والدہ ان کا اتنا خیال تو رکھتی ہیں۔'' وہ دوبارہ باہر چلا گیا۔

سری داس اتنا بالحاظ تھا کہ اس نے ابا کے کمرے میں سارا سے بات چیت کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس کے باہر آنے تک وہ گھر میں ہر طرف پھرتا رہا۔ کمرے سے جلتی ہوئی لوبان کی بو اور ہلکی ہلکی بڑبڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔

''ارانولس کوئی جادوئی عمل کر رہا ہے۔ ہمیں ابا کو شیطانی اثرات سے بچانا چاہیے۔'' مینکا نے ابا کے کمرے سے آتے ہوئے کہا۔

عام حالات میں مینکا ارانولس کی مالس سے زیادہ عزت نہیں کرتی تھی لیکن جب اس نے اپنا بے داغ سفید لباس پہنا اور بحیثیت عامل کام شروع کیا تو وہ اس سے پوری طرح خوفزدہ ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کمرے میں نہیں ٹھہرتی تھی جہاں ارانولس ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ارانولس بہت پر اسرار نظر آتا۔ وہ ہمیں بھیانک سوچوں سے پریشان کرتا ہوا

مخفی قوتوں کو مخاطب کرتا۔ نیم تاریکی میں انگیٹھی سے اٹھنے والا لوبان کا دھواں منتر کی سانپ جیسی سی سی اور قدیم زبانوں کی پر سرار آوازوں کے ساتھ مل کر عجیب وغریب اور غیر مہذب کیفیات کو جنم دیتا تھا۔ ارانولس ایک مافوق الفطرت ناچنے والا بن گیا۔

لوبان کی بو اور پراسرار منتر جن کی وجہ سے مینکا ابا کے کمرے سے چلی آئی تھی مجھے اس کمرے میں لے گئے۔ ارانولس ایک نیچی کرسی پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کا دھڑ ننگا تھا۔ سفید نچلا لباس جو اس نے پہن رکھا تھا اس کی داڑھی کے کالے پن کو نمایاں کر رہا تھا۔ میں منتر کے تمام الفاظ میں امتیاز نہ کر سکا۔ وہ اپنی داڑھی میں بڑ بڑا رہا تھا اور صرف زیادہ گونجدار آوازیں مجھ تک واضح طور پر پہنچ رہی تھیں۔ لوبان سے اٹھنے والا دھواں چھت تک پہنچ کر غائب ہو جاتا لیکن اس کی بو میرے پھیپھڑوں کے اندر تک دھنس رہی تھی۔

اماں نے مجھ سے سرگوشی میں بات کی:

''کیا سارا گھر چلی گئی ہے؟''

''نہیں۔''

''دھرم داس؟''

''ہاں، لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ جلد ہی واپس آجائے گا۔''

''مینکا سے کہو وہ دیکھے کہ کیا دوائی کے لیے جڑی بوٹیاں ابال دی گئی ہیں۔ باورچی یہ کام صحیح طرح نہیں کرتا۔''

ارانولس نے اپنی ہتھیلیاں مریض کے جسم پر ماتھے سے لے کر پیروں تک پھیریں۔ پھر اس نے ابا کے کانوں کے قریب اپنی انگلیاں چٹخائیں۔ اماں یہ دیکھ کر بہت خوش تھیں کہ اس کے مسلسل جاپ سے ابا سو گئے ہیں۔ انہوں نے اسے بہتری کی نشانی سمجھا۔

اس امکان نے کہ ابا کی بیماری کی وجہ سے شاید مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑے مجھے پریشان کرنے کی بجائے خوش کیا۔ امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے بہت آسانی سے کلرک کی نوکری مل سکتی تھی اور پھر میں اپنے طریقے سے کیمسٹری پڑھنے کے قابل ہو سکتا تھا۔ میں کیمسٹری کی کتابوں میں دیے گئے تجربے کر کے بہت لطف اٹھاتا۔ ایک دن میں

لال سنکھیا کسی چیز کے ساتھ ملا رہا تھا کہ سب کچھ بھک سے اڑ گیا۔ میرا ایک ہاتھ بھی جل گیا لیکن اس واقعے نے اس قسم کے تجربوں کے لیے میری بھوک بڑھا دی۔

سری داس اب واضح طور پر سارا میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ اسے خوش کرنے کی پوری کوشش کرتا۔ وہ ایک امیر آدمی تھا اور سارا کے والدین کو یقیناً اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

سارا کا باپ ایک امیر تاجر تھا جبکہ اس کی ماں بلند معاشرتی مقام حاصل کرنے کی خواہش مند تھی۔ وہ کبھی سارا کی حوصلہ افزائی نہیں کریں گے کہ وہ میرے متعلق سوچے۔ لیکن میرے متعلق سارا کا رویہ تبدیل نہیں ہوا تھا اور وہ خاصی بے خوف اور بے باک تھی۔ جب ہم سڑکوں پر یا کالج میں لوگوں کی موجودگی میں بھی ملتے تو مجھ سے مسکرا کر بات کرنے سے یا پھر مجھے چھیڑنے سے نہ ہچکچاتی اور اس کے باوجود میں کبھی اپنے شرمیلے پن اور بزدلی پر قابو نہ پا سکتا۔ سارا بعض اوقات مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ایک بالغ اور پوری عورت نظر آتی۔

''تم کہتے ہو کہ تم ڈاکٹر نہیں بننا چاہتے۔'' اس نے مجھ سے ایک مرتبہ کہا۔ ''درحقیقت تم امتحان بالکل نہیں دینا چاہتے۔ تم کس قسم کی نوکری حاصل کرو گے؟''

''میں نے ابھی اس کے متعلق نہیں سوچا۔ مجھے پیسہ کمانے کی بے چینی نہیں ہے۔''

سارا مسکرائی۔

''تم نوکری کے بغیر شادی کس طرح کر سکتے ہو؟ تم بغیر پیسے کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور پھر تمہیں کرائے پر گھر بھی لینا پڑے گا۔''

''میں نے اس سب کے متعلق نہیں سوچا۔''

وہ دوبارہ مسکرائی۔ وہ مجھ پر ہنس رہی تھی یا پھر میرے جواب پر؟

''اور گھر کرائے پر لینے کے بعد تمہیں کچھ سامان بھی لینا پڑے گا۔ اور ملازم......''

مجھے سارا سے بہت محبت تھی۔ پھر بھی میں نے کبھی شادی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ اس وقت تک میں نے جوان لوگوں کو دو یا تین مرتبہ سے زیادہ

شادی کے بارے میں بات کرتے سنا ہو۔ یقیناً میں ایک پکا دیہاتی لڑکا تھا جسے گاؤں سے باہر کی دنیا کے متعلق کچھ پتا نہیں تھا۔ میں نے عمر رسیدہ لوگوں کو اپنے بچوں کی شادی کے متعلق باتیں کرتے سنا تھا لیکن میرے اپنے والدین نے کبھی مجھ سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ سارا مشورہ دے رہی تھی کہ مجھے اس کے متعلق سوچنا چاہیے۔ لیکن ایسا کرنے کا کیا فائدہ تھا؟ ہمیں کبھی بھی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ ہمارے والدین ہمارے لیے اس سب کا بندوبست کر دیں گے۔

''میں تمہاری پسند کی کوئی بھی نوکری کر لوں گا۔'' میں نے کہا۔

سارا دوبارہ مسکرائی۔

''سنئیر امتحان پاس کرنے کے بعد میں بہت آسانی سے گورنمنٹ کلریکل سروسز کا امتحان پاس کرسکتا ہوں۔'' میں نے مزید کہا۔

''اروندا، میں تم سے یہی سننا چاہتی تھی۔''

اس کے سوال یقیناً کسی شک کا نتیجہ تھے جس کے متعلق وہ مجھے نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ وہ مجھے خط لکھتی تھی۔ بہر حال جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے یہ ماننا پڑے گا کہ بعض اوقات میں ایسی باتیں کہتا تھا جن کی وجہ سے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتی تھی کہ میری محبت شرمسارانہ اور بزدلانہ ہے۔ سارا نے مجھے کبھی واضح الفاظ میں یہ نہ بتایا کہ اسے ڈر ہے کہ اس کے والدین مجھے قبول نہیں کریں گے۔ بہر حال ایسے موقعے بھی آئے جب مجھے احساس ہوا کہ اس کی کہی ہوئی کچھ باتوں کے پیچھے یہ ڈر چھپا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ اپنا اور میرا مستقبل اتنی بالغ نظری سے اس لیے زیر بحث لاتی تھی کہ وہ پہلے ہی اپنے والدین سے نا امید ہو چکی تھی۔

چھٹا باب

پتا نہیں مستقبل میں اماں کو کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا؟ مجھے معلوم تھا کہ وہ بے چین ہیں۔ وہ اور مینکا دن رات ابا کی تیمارداری میں مصروف رہتیں۔ مینکا شادی شدہ تھی اور اس کا مستقبل غیر یقینی نہیں تھا۔ وہ اس کے متعلق سوچتی بھی نہیں تھی۔ اماں کی صورتحال کافی مختلف تھی۔ ان کے پاس مستقبل کے بارے میں تذبذب کا شکار ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

اگر ابا فوت ہو گئے تو کیا ہوگا؟ ہمارا انحصار مکمل طور پر ابا کی بحیثیت طبیب روزانہ آمدنی پر تھا۔ ہمارا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں تھا۔ میرے والدین میں سے کوئی بھی کنجوس نہیں تھا اور انہوں نے کچھ بچانے کے متعلق سوچا تک نہ تھا۔

اماں جانتی تھیں کہ ہمارا گزارہ روزانہ آمدنی پر ہے۔ غالباً انہوں نے سوچا تھا کہ ابا بینک یا اس قسم کی کسی دوسری جگہ پر کچھ بچا رہے ہیں۔ ابا کو بیمار ہوئے دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے کہ اماں پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ انہوں نے تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں بچائی تھی۔

وہ اسی پر خوش تھے کہ ہماری ہر خواہش پوری ہو رہی تھی اور انہوں نے مستقبل کے بارے میں سوچ کر خود کو پریشان نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس شخص کا مذاق اڑاتے تھے جو پیسہ بچانے کی عادت کی تعریف کرتا اور کہتے تھے کہ زندگی کا مقصد پیسہ بچانا نہیں بلکہ جس کے پاس جتنا پیسہ بھی ہے اسے خرچ کرنا اس کا بہترین استعمال ہے۔ ہاں انہوں نے ہمیں خوش دیکھ کر تسکین حاصل کی تھی اور مستقبل کے بارے میں بالکل نہیں سوچا تھا۔ ہوشیار

اور جاہ طلب لوگ جو کہ دنیا میں آگے بڑھنے کے خیال سے دولت کے انبار لگاتے ہیں میرے ابا جیسے لوگوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہمیشہ یہی جملہ دہراتے: ''وہ ایک اچھا آدمی ہے لیکن ہے نرا احمق!'' ابا اتنے لاتعلق تھے کہ انہوں نے ناراض ہوئے بغیر یہ حقیقت قبول کرلی تھی کہ ان کو بعض اوقات ایسے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔

وہ اپنی استعداد سے زیادہ کام کرتے تھے۔ وہ پورے دل و جان سے کام میں جت جاتے اور صرف سوتے وقت کام نہ کرتے۔ وہ اتنی محنت صرف ہماری روزمرہ کی ضروریات پورا کرنے کے لیے نہیں کرتے تھے۔ وہ ایسا کرنے میں لطف اٹھاتے تھے۔ بعض اوقات میں اپنی اور اماں کی خودغرضانہ بے پروائی پر افسردہ ہو جاتا۔ ہم آسائشوں کو اپنا حق سمجھتے اور یہ نہیں سوچتے تھے کہ وہ ابا کی انتہائی پرخلوص محنت کا پھل ہیں۔

ہم ملک کے جس حصے میں رہتے تھے وہاں لوگ صرف اتنی محنت کرکے مطمئن نہیں ہو جاتے ہیں جس سے روزی روٹی کمائی جا سکے۔ سوائے کچھ خاندانوں کے جن کے پاس اچھی خاصی جائداد تھی باقی کنبوں کے سربراہ اپنے گھر والوں کو ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے کسی بھی حد تک محنت کرنے کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ بچے اس بات کی توقع کرتے تھے بلکہ معاشرے کا قائم کردہ معیار اتنا ہی کڑا تھا، بالخصوص تعلیم اور شادی کے سلسلے میں۔ ہم ان قدروں کے بارے میں اتنے لاپرواہ تھے کہ ہمیں کبھی یہ احساس ہی نہ ہوا کہ یہ بوجھ ابا کے لیے بہت زیادہ ہوگا۔

انہوں نے کبھی اپنی تکلیف کی طرف توجہ مبذول کروانے کی کوشش نہ کی۔ وہ صرف اس وقت پریشان نظر آتے جب وہ کسی کو بلاتے اور اماں یا مینکا میں سے کوئی پاس نہ ہوتا۔ مینکا نے ہمیں بتایا کہ ایک ایسے موقعے پر اس نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ غالباً وہ تنہائی محسوس کرتے تھے یا پھر مفلوج ہونے سے پہلے کے دن، جب وہ ہمارے لیے اتنا انتھک کام کرتے تھے، یاد کرکے افسردہ ہو جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کمزوری یا اپنی تکلیف کو برداشت نہ کرنے کی بے بسی کی وجہ سے آئے تھے بلکہ اس احساس کی وجہ سے کہ وہ ہمارا خرچہ نہ اٹھا کر ہماری امیدوں پر پورے نہیں اتر رہے تھے۔ رسم و رواج کا تقاضا تھا کہ وہ ایسا کرتے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ والدین نے خود بھوکے

رہ کر اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے پیسے بچائے ہیں۔

مینکا نے بے انتہا ہمدردی اور محنت اور انتھک قوت سے ابا کی تیمارداری کی۔ وہ اس کے اتنے گرویدہ ہو چکے تھے کہ اگر وہ صرف چند گھنٹوں کے لیے بھی اسے اپنے قریب نہ پاتے تو پوچھتے: ''کیا مینکا اپنے گھر چلی گئی؟''

لیکن مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ تیمارداری کے لیے مینکا کا جذبہ ابا کے اپنے مریضوں کے لیے خلوص سے بہت مختلف تھا۔ پہلے ایک یا دو ہفتے گزرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ مینکا محنت سے بالکل نہیں گھبراتی لیکن وہ ضرورت کے تیل اور دوائیاں خریدنے کے معاملے میں اس قدر کنجوس ہے کہ لوگوں کو دھوکا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔

میں کلرک بن کر آسانی سے گزر بسر کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ہمارا جمع جتھا ختم ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود میں نے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا۔ میں نے اپنے آپ سے یہ تک کہا: ''صرف خودغرض لوگ مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں!'' میرا خیال ہے کہ میں نے یہ مقولہ اپنے کردار کی کمزوری کو پہچاننے سے بچنے کے لیے ایجاد کیا تھا۔ مجھے ٹھیک تو نہیں پتا لیکن شاید یہ محاورہ کسی پرانے دور کے پنڈت سے ہم تک پہنچا تھا۔

اگرچہ میں اپنے مستقبل کے بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتا تھا لیکن میں اس چیز کے متعلق بہت سوچتا تھا کہ مستقبل میں اماں کو کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ وہ مینکا سے مدد مانگنے کی بجائے خاموشی سے تکلیف جھیلنے کو ترجیح دیں گے اور میں خود ان کی مدد کس طرح کر سکتا تھا اگر میں کچھ کمانے کی کوشش نہ کرتا؟ ابا نے ان کے متعلق نہ سوچ کر غلطی کی تھی۔ بلاشبہ انہوں نے سوچا تھا کہ ان کے بچے انہیں اور اماں کو ایک سمجھیں گے۔ ہم اماں کا اتنا ہی خیال رکھیں گے جتنا ان کا رکھتے تھے۔ دیہاتی معاشرے میں بچوں اور والدین کو ہمیشہ ایک سمجھا جاتا ہے۔ والدین پسند کرتے ہیں کہ ان کے شادی شدہ بچے ان کے ساتھ ہی رہیں چاہے اس مقصد کے لیے انہیں اپنے گھر میں نئے کمروں کا اضافہ کرنا پڑے۔

ہمارے دیہاتی میاں بیوی، جان من، میری پیاری، میری زندگی، میری محبوبہ جیسے

الفاظ کے استعمال کو اتنا ہی برا سمجھتے ہیں جتنا سرعام چومنے یا گلے ملنے کو۔ وہ اپنی چاہت کے کھلم کھلا اظہار پر یقین نہیں رکھتے اور ان کے تعلقات داخلی اور بے زبان ہوتے ہیں۔ ابا اور اماں نے بھی ایسے ہی زندگی گزاری تھی۔ ابا اپنی ساری کمائی اماں کے ہاتھ میں دے دیتے۔ انہوں نے کبھی یہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ پیسے کہاں خرچ ہوئے۔ اور گھر چلا کر اماں بھی ابا کا خیال رکھتیں۔

ابا کے کچھ مریض اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ وہی ان کی دوائیں بنائیں۔ جب مینکا نے گولیوں، تیل اور لیپ کی فروخت سے ہونے والی کمائی دیکھی تو اس نے تجویز پیش کی کہ میں ابا کے کاروبار کو سنبھال لوں۔ میں نے اس مشورے کو مذاق سمجھا۔ میں سارا کے متعلق سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ کیا وہ میرا دوا ساز بننا پسند کرے گی؟ اگر میں نے اس خیال کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہوتا تو مینکا نے یقیناً ترکی بہ ترکی جواب دیا ہوتا:

''کیوں نہیں؟ یقیناً پسند کرے گی۔ وہ تمہاری طرح بے عمل کتابی کیڑا نہیں ہے۔''

سری داس نے مینکا کی حمایت کی جبکہ اماں نے کچھ نہ کہا۔

مینکا نے کہا کہ جو کچھ مجھے جاننے کی ضرورت ہے میں خود ابا سے سیکھ سکتا ہوں۔ دوائیں اور تیل بنانے کے لیے ہم ابا کے ملازم کی نوکری برقرار رکھ سکتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مختلف گولیاں اور تیل کن طریقوں سے بنائے جاتے ہیں۔ مجھے صرف یہ سیکھنے کی ضرورت پڑے گی کہ بیماریوں کی تشخص کس طرح کرنی ہے اور ان کے لیے دوائیں کیسے تجویز کرنی ہیں۔

''یہ مریضوں کا علاج کرنے کا نہیں بلکہ انہیں مارنے کا یقینی طریقہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ میں طب بالکل نہیں سیکھنا چاہتا اور نہ ہی میں نے ایسا کچھ پڑھ رکھا ہے جو میرے کام آئے گا۔''

''اور کیمسٹری جو تم پڑھتے ہو؟ وہ تمہارے لیے مددگار ثابت ہوگی۔ اگر تمہیں کیمسٹری کا علم ہو تو تم واقعی بہت اچھے ڈاکٹر بن سکتے ہو۔''

''مجھے کیمسٹری کا کیا پتا؟'' میں نے ناراضگی سے کہا۔

سری داس بھی گفتگو میں شامل ہوگیا: ''اروندا، تمہیں انگریزی آتی ہے۔ وہ بہت مددگار ثابت ہوگی۔ ایک بنگالی ڈاکٹر ناگندر ناتھ نے ایورویدک پر انگریزی میں تین موٹی موٹی کتابیں لکھی ہیں۔ تم ان کتابوں سے ضرورت کی تمام چیزیں سیکھ سکتے ہو۔''

''اس سے بہتر ہے کہ میں جیب کترا بن جاؤں۔ میں کسی صورت بھی ایسا عطائی نہیں بنوں گا جس کے پاس چند نسخوں کے سوا کچھ نہ ہو۔''

میری بات نے انہیں ناراض کردیا، حتیٰ کہ سری داس کو بھی۔

''تم خود اپنے باپ کی بے عزتی کر رہے ہو۔ ہر ڈاکٹر کو نسخے لکھنے پڑتے ہیں۔ تم نسخے لکھے بغیر لوگوں کا علاج کس طرح کر سکتے ہو؟'' مینکا نے غصے سے پوچھا۔

''جو ڈاکٹر نسخے لکھتا ہے وہ عطائی نہیں ہوتا لیکن مناسب تربیت کے بغیر لوگوں کا علاج شروع کر دینا سراسر دھوکہ دہی ہے اور میں ایسا طبیب نہیں بنوں گا۔''

''مناسب تربیت ضروری ہے لیکن اب تو مجھے بھی معلوم ہے کہ کسی مفلوج کا علاج کیسے کیا جاتا ہے۔'' مینکا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔

''اچھا تو پھر تم خود ابا کا کاروبار کیوں نہیں سنبھال لیتیں؟''

''اگر تم نہیں مانو گے تو پھر مجھے ہی ایسا کرنا پڑے گا!''

میرا خیال ہے کہ وہ سنجیدہ تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسے علوم سیکھنے میں اچھی تھی جن کے لیے مہارت اور مشق کی ضرورت ہو۔ اور آیورویدک کا زیادہ تر انحصار مشق پر ہی ہوتا ہے۔ یقیناً مینکا اس امکان سے ذرا بھی پریشان نہیں تھی کہ سائنسی نظریات سے کلی ناواقفیت خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

''وید امر سنگھے نے خود بھی طب پہلے وید جیا تلک سے سیکھا تھا۔'' سری داس نے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے کہا۔

''وید امر سنگھے نے عملی زندگی کا آغاز وید جیا تلک کے ملازم کی حیثیت سے کیا تھا۔ آٹھ برس تک وہ ان کی دوائیاں (گولیاں، تیل اور لیپ) بنانے اور نسخے لکھنے پر مامور رہے۔ جب وید جیا تلک ملک کے کسی دوسرے حصے میں چلے گئے تو وید امر سنگھے نے ان کے مریضوں کو سنبھال لیا۔ وید امر سنگھے نے جب پہلے پہل کام کا آغاز کیا تو وہ سنسکرت بھی

نہیں پڑھ سکتے تھے۔''

''میں نے سکول میں کچھ سنسکرت سیکھی تھی۔'' مینکا نے ہمیں ہنسنے پر مجبور کرتے ہوئے کہا۔ ویدا مرسنگھے کی شروعات کے متعلق سری داس کی کہانی سن کر وہ واقعی بلند حوصلہ نظر آ رہی تھی۔

اماں کو خطرہ محسوس ہوا۔ اگر مینکا نے ابا کے مریضوں کو دیکھنا شروع کر دیا تو حشر برپا ہو جائے گا:

''تمہارے ابا کے کام پر اروندا کا حق ہے۔'' آخر کار انہوں نے اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن اروندا ایسا نہیں چاہتا۔'' سری داس نے کہا۔

''اگر وہ ایسا نہیں چاہتا تو میں خود اسے کیوں نہ سنبھال لوں؟''

مینکا فوراً خاموش ہو گئی۔ وہ صورت حال کو جانچنے میں ماہر تھی۔ سری داس نے فوراً اماں کی حمایت کی۔

''چچی، مجھے آپ کا خیال نہیں آیا تھا۔'' اس نے بے تکلفی سے اعتراف کیا۔ ''یقیناً چچا کے کام پر آپ کا حق ہے مینکا کا نہیں۔''

''نہیں بچے، میں تو صرف مذاق کر رہی تھی۔ میں کیا جانوں طب کیا ہے۔ میں یہ جانے بغیر کہ کیا کرنا ہے مریضوں کا علاج کیسے کر سکتی ہوں؟''

''چچی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ نے طب کتابوں سے نہیں سیکھی؟ مجھے یقین ہے کہ آپ کو علم ہے کہ چچا کیا کرتے تھے۔ بہر حال تھوڑی بہت طب سیکھنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔''

''ہاں آپ ایسا مجھ سے بہت بہتر طور پر کر لیں گی۔'' مینکا نے کہا۔ ''تیل اور دوائیوں کا ذخیرہ کم از کم ایک برس اور چل سکتا ہے۔ اماں، آپ کو واقعی اسے اپنے ہاتھوں میں لے لینا چاہیے۔''

یہ ساری بحث محض وقت کا ضیاع تھی۔ اگر ابا کا انتقال ہو گیا تو ان کے مریض ہمارے پاس آئیں گے؟ یہ درست ہے کہ شروع میں ابا کو بھی طب کا کچھ خاص علم نہیں تھا

اور انہوں نے اپنا کام وقت کے ساتھ ساتھ سیکھا تھا۔ انہوں نے کبھی طب کا تفصیلی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ان کی کامیابی کا انحصار تجربے میں اضافے پر تھا اور ان کی اس شہرت پر کہ ان کے ہاتھ میں شفا ہے۔ لوگ کسی کام کے ساتھ آپ کی جانثارانہ لگن کے نتیجے میں حاصل ہونے والی کامیابی کو قسمت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ ابا اپنے کام کو اس طرح لیتے تھے جیسے وہ صرف پیشے کی بجائے کسی فن کی مشق کر رہے ہیں۔ علم میں مسلسل اضافہ اور تکمیل کا احساس (اور وہ پیسہ نہیں جو انہوں نے کمایا) وہ انعامات تھے جنہیں وہ عزیز رکھتے تھے۔ جب کوئی شدید بیمار مریض ان کے زیر علاج تھوڑا سا بھی بہتر دکھائی دیتا تو وہ اتنا ہی خوش ہوتے تھے جتنا کوئی مالی اپنے لگائے ہوئے پودے پر پھول اور پھل آتے دیکھ کر ہوتا ہے۔ وہ دوائیوں کی تیاری کے سلسلے میں اتنے محتاط تھے جتنا کوئی مجسمہ ساز اس مٹی کے معیار کے بارے میں ہوتا ہے جیسے وہ ڈھال رہا ہو۔ وہ اپنے مریضوں کو نہایت پابندی اور باقاعدگی سے دیکھتے تھے چاہے وہ انہیں پیسے ادا کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔ وہ اپنے مریضوں میں اتنی دلچسپی بنیادی طور پر اس لیے نہیں لیتے تھے کہ انہیں ان سے محبت تھی بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے علاج کا اثر ہوتے ہوئے دیکھنا پسند کرتے تھے۔ جب کسی مریض کی بہت ہی خراب حالت میں ان کی کسی خاص دوائی کی وجہ سے بہتری ہوتی تو وہ اس کے بعد کے علاج کی تفصیلات مریض کی دیکھ بھال کرنے والے شخص کو بڑی احتیاط سے باربار دہراتے ہوئے سمجھاتے۔ جو مریض ان کی تجویز کردہ دوائیں اور غذا بخوبی کھا لیتے تھے وہ انہیں خاصا چاہنے لگتے تھے۔ وہ ان سے دوستی کر لیتے اور ان موضوعات پر گفتگو کرتے جن کا ان کی بیماری سے دور دور کا بھی کوئی واسطہ نہ ہوتا۔

''ادھر ادھر کی مت ہانکو!'' اماں نے کہا۔ وہ اس بات پر خاصی برہم تھیں کہ مینکا نے ابا کا کام سنبھالنے کے متعلق سوچا بھی کیوں۔ لیکن وہ اس کو دکھ پہنچانے سے گریزاں تھیں جبکہ وہ ابا کے لیے اتنا کچھ کر رہی تھی۔

''اس پر آپ کا حق ہے۔'' انہوں نے اماں کو دوبارہ ترغیب دی۔

اماں کو واقعتاً غصہ آ گیا۔ ''مجھے طب کا کیا پتا؟'' کچھ دیر بعد انہوں نے زیادہ

پرسکون طریقے سے کہا:

''اس وقت اس موضوع پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر مجھے غصہ نہ آگیا ہوتا تو میں گفتگو میں شامل ہی نہ ہوئی ہوتی۔ مینکا دیکھو کیا تمہارے والد جاگ رہے ہیں؟ کیا ابھی تک دوائی کا وقت نہیں ہوا؟ خیر تمہیں مجھ سے بہتر پتا ہے کہ دوائی کب دینی ہے۔ میں دیکھتی ہوں جوشاندہ تیار ہوا ہے یا نہیں۔''

مینکا کچھ کہے بغیر ابا کے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے اس ساری گفتگو سے خود کو اتنا تھکا ہوا محسوس کیا کہ میں نے سری داس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے برعکس اس پر شدید گرمی کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی بشاشت کو کوئی چیز کم نہیں کر سکتی تھی حتیٰ کہ بدقسمتی بھی۔ وہ فطرت کی قوتوں سے یا پھر انسانوں کی کمینگی یا دھوکا دہی پر غمگین نہیں ہوتا تھا۔ جب میں نے تنگ مزاجی سے کہا: ''بہت گرمی ہے۔'' تو وہ صرف ہنسا اور اس نے کہا، ''گرمی؟''

کچھ کسان گاہنے کی مشین پر کام کر رہے تھے۔ وہ پسینے سے تر تھے لیکن اس کے باوجود گرمی سے پریشان نہیں نظر آتے تھے جیسے ان کی جلد پہلے ہی اتنی مضبوط ہو چکی ہو کہ اس پر جھلسا دینے والی دھوپ بھی بے اثر ہو۔

''یہ کتنی محنت کرتے ہیں!'' میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''وہ کری اپو بہت اچھا کام کرنے والا ہے۔'' سری داس نے ایک دبلے پتلے مزدور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عورتیں جنھوں نے اپنے سروں پر کپڑے باندھ رکھے تھے بھوسہ اکٹھا کر کے اس کے انبار لگا رہی تھیں۔ خشک میدان پہاڑیوں کے دامن تک پھیلے ہوئے تھے اور بلند ہوتی ہوئی زمین پر ناریل کے درختوں میں سے میں نے بہت فاصلے پر آسمان کے ٹکڑے دیکھے۔ کھلے میدانوں میں بہت دیر تک چلنے کے بعد ہم بالآخر سایہ تھا۔ ہم چلتے چلتے ایک بدرو کے پاس سے گزر کر مرکزی سڑک پر آ گئے۔ ہم بہت سے چھوٹے چھوٹے گھروں کو، جن کے گرد چھدری باڑیں تھیں، پیچھے چھوڑتے ہوئے ایک سفید دیوار میں لگے ہوئے گیٹ تک پہنچے۔ ہم بہت دیر تک کھڑے اس بڑے گھر کو دیکھتے رہے جو بہت سے اسلوبوں کو غیر معمولی

طریقے سے ملا کر تعمیر کیا گیا تھا۔

''کیا سارا کی طرف چلیں؟'' سری داس نے پوچھا۔

میں نے فوراً جواب نہ دیا۔ وہ سارا سے ملنے میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتا تھا؟ اسے یقیناً اس بات کا علم نہیں تھا کہ مجھے سارا سے محبت ہے۔

''سارا کی والدہ اس وقت ہمارا آنا پسند نہیں کریں گی۔ وہ اس وقت یقیناً مصروف ہوں گی۔''

ایک قریب سے گزرتی ہوئی بیل گاڑی میں سے دو عورتوں نے ہمیں گھور کر دیکھا۔ ان میں سے ایک نے سری داس کو پہچان لیا اور مسکرائی جیسے اسے سلام کر رہی ہو۔ شادی کی عمر تک پہنچی ہوئی بیٹیوں کی مائیں سری داس جیسے امیر نوجوانوں میں بہت دلچسپی لیتی تھیں۔

سری داس نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہنے لگا:

''سارا کی والدہ کو بظاہر میرا اس سے ملنے کے لیے آنا پسند نہیں ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر سارا کے لیے واضح پسندیدگی نظر آ رہی تھی۔

''اروندا......'' لیکن اس نے اپنی بات مکمل نہ کی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے متلاشی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ وہ مجھے اعتماد میں لینے والا ہے۔

''میں کالج میں سارا سے اکثر ملا کرتا تھا۔'' اس کے چہرے پر ابھی تک ایک واضح مسکراہٹ تھی۔

''ہم کالج میں لڑکیوں سے ملنے سے نہیں بچ سکتے۔''

''کالج چھوڑنے کے بعد میں نے اس کے متعلق رائے بدلنا شروع کر دی۔'' اس نے میری بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''کیا اس نے کوئی غلط کام کیا تھا؟''

وہ میری بات نہیں سن رہا تھا۔

''میں نے اس سے محبت کرنا شروع کردی۔'' اس نے کہا۔ ''اس کی والدہ مجھے پسند نہیں کرتیں۔ وہ اس کی شادی کسی وکیل یا ڈاکٹر سے کرنا چاہتی ہیں۔ سارا کے والدین کے پاس بہت دولت ہے۔''

میں نے اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش کی۔ اگر وہ مجھ سے یہ سب باتیں کر رہا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سارا میں سنجیدگی سے دلچسپی لے رہا تھا۔

''کیا سارا تمہیں پسند کرتی ہے؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''میں نے ابھی اس سے نہیں پوچھا۔ میں نے اس کے والد سے بات کی ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اس کی والدہ اس کے خلاف ہیں۔''

یہ سن کر میں پرسکون ہوگیا۔

''کیا تمہیں سارا کے والدین سے بات کرنے سے پہلے اس سے نہیں پوچھنا چاہیے تھا؟''

''وہ مجھے یقیناً بہت پسند کرے گی۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسا نہ کرے!'' وہ ہنسا۔ ''اگر اس کے والدین نے مجھے قبول کرلیا تو یہ یقینی ہے کہ وہ مجھے پسند کرے گی۔''

عورتوں کے متعلق ہمارا رویہ کتنا مختلف تھا! وہ کسی جوان عورت کی محبت کو جیتنا بہت آسان معاملہ سمجھتا تھا۔ ''وہ مجھے یقیناً بہت پسند کرے گی۔'' سے خود پر یقین تھا۔ ایسا آدمی عورت کے ساتھ آسانی سے کامیاب رہتا ہے۔ جونہی اس نے سارا سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس نے اس کے والدین سے اس سلسلے میں بات کرلی تھی اور ایک میں تھا جس نے سارا کی حوصلہ افزائی کے باوجود بھی شادی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ شادی کا خیال مجھے شرمندہ کر دیتا حتیٰ میرے کسی مخفی خوف کو بیدار کر دیتا۔ میرے دوست اکثر محبت پر بحث کرتے تھے لیکن شادی کبھی ہماری گفتگو کا موضوع نہیں بنی تھی۔

''تمہیں کیسے پتا کہ سارا تمہیں پسند کرے گی؟'' عورتوں اور شادی کے متعلق اس کی دیدہ دلیری نے مجھے اس سے مزید سوال پوچھنے پر مجبور کردیا۔

''سارا مجھے پسند کرے گی۔'' اس نے پھر وثوق سے کہا۔

''کیا اس نے تمہیں اپنے والدین سے بات کرنے کے لیے کہا تھا؟''

''ایسا نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے پسند کرے گی۔'' اس نے پہلے سے بھی زیادہ اعتماد سے کہا۔

کیا وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا تھا؟ کیا سارا نے اسے بتایا تھا کہ اگر اس کے والدین اسے پسند کرلیں تو وہ بھی اسے قبول کرلے گی؟

''پھر تو تم نے اس سے کسی نہ کسی طرح بات کی ہے اور مجھ سے چھپانے کی کوشش کررہے ہو۔''

میرے لیے اپنا غصہ اور تکلیف چھپانا مشکل تھا۔ اس نے مجھ سے میرے منصوبوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ میرے جوابوں پر ہنسی تھی۔ کیا اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس سے محبت کرنے کے باوجود شادی کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا؟ سری داس کو جونہی اس سے محبت ہوئی اس نے شادی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے محبت کرتا تھا لیکن میں نے شادی کی حد تک نہیں سوچا تھا۔

''اروندا، نہیں۔'' اس نے اپنا بازو میرے کندھوں کے گرد لپیٹے ہوئے کہا۔''اب تک میں نے اس سے چند مرتبہ بات چیت کی ہے لیکن میں نے اسے کبھی یہ نہیں بتایا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ مجھ سے باتیں کرنا پسند کرتی ہے۔ اس نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا نہیں خیال کہ اگر میں اسے شادی کی پیشکش کروں تو وہ مجھے ٹھکرائے گی۔''

''سارا ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی کہ شادی کے متعلق سوچے۔''

سری داس نے زوردار قہقہ لگایا۔

''جیسے بطخوں کو یہ سکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ تیرتے کیسے ہیں اسی طرح لڑکیوں کو یہ سکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ شادی کے متعلق سوچیں!''

شادی اور عورتوں کے متعلق سری داس کے خیالات کافی حقیقت پسندانہ اور عملی تھے۔ میں سارا کے متعلق اس معلومات کے لحاظ سے سوچتا تھا جو میں نے عشقیہ کہانیوں اور شاعری سے حاصل کی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سارا کے متعلق میرے سوچنے کا انداز مجھے ایک ایسی باطنی خوشی دیتا تھا جس سے سری داس محروم تھا۔ اس کی خوشی کا تمام تر

دارومدار سارا سے شادی پر تھا۔

سری داس کے وسیع وعریض گھر میں داخل ہوتے ہی مجھ پر افسردگی طاری ہوگئی۔ ناریل اور کاس کے درختوں کے سائے نے تین ایکڑ پر پھیلے ہوئے مکان پر پوری طرح غم طاری کر رکھا تھا۔ اس معلومات نے کہ سری داس اور اس کی والدہ گھر کے واحد باسی ہیں میرے احساس افسردگی میں مزید اضافہ کر دیا۔

''تمہارے والد ٹھیک ہیں؟'' سری داس کی والدہ نے پچھلے صحن سے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''سچ پوچھیں تو ان کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے، چچی، آپ بہت بدل گئی ہیں۔''

وہ ایک درمیانی عمر سے زیادہ کی لمبی اور بڑے ڈیل ڈول کی خاتون تھیں جن کی موجودگی ان کی عزت کرنے پر مائل کرتی تھی۔

''بڑھاپے کے ساتھ لوگ بدل جاتے ہیں! تم کافی عرصے سے ہم سے ملنے نہیں آئے؟''

''اب میرے امتحان کافی نزدیک ہیں۔ میرے پاس کہیں بھی جانے کا وقت نہیں ہوتا۔''

''بیمار ہونے سے صرف ایک ہفتہ پہلے تمہارے والد یہاں آئے تھے۔ مینکا بھی ہم سے ملنے نہیں آتی۔''

''وہ چچا کی تیمارداری کر رہی ہے۔'' سری داس نے کہا۔''وہ اپنی والدہ کا بہت بڑا سہارا ہے۔''

''وہ اس طرح کے کام بہت اچھے طریقے سے کرتی ہے۔'' چچی نے سانس لینے کے لیے بیٹھتے ہوئے کہا۔''میرے خیال میں تمہارے والد کو بیمار ہونا ہی تھا۔ یہ یقیناً ان کا مقدر تھا۔ میں باہر باغ میں گئی تھی۔ میں نے اس کی کچھ صفائی کروائی ہے۔ تمہارے چچا اسے بہت اچھی حالت میں رکھتے تھے۔''انہوں نے افسردگی سے کہا۔

اس بڑے گھر کے چوکھٹوں، کھڑکیوں، کڑیوں، شہتیروں اور چھت کو دیکھ کر ہر کوئی یہی سوچتا ہے کہ سری داس کے مرحوم والد یقیناً ایک زیرک اور مضبوط ارادے کے مالک

شخص تھے جو ہر کام احتیاط اور دل لگا کر کرتے تھے۔ کاس کی لکڑی کی کھڑکیاں دوازوں جتنی بھاری تھیں اور بڑے بڑے چوکھٹے پرانے محلات میں نظر آنے والے چوکھٹوں سے مشابہہ تھے۔ وارنش لگی کڑیاں بھی شہتیروں جتنی موٹی تھیں۔ نفیس مرصع کام والا آبنوسی صوفہ بھی اتنا بھاری نظر آتا تھا کہ میرے خیال میں چار آدمی بھی اسے نہیں اٹھا سکتے تھے۔

ایک کونے میں تراشے ہوئی آبنوسی چوکھٹے میں ایک بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ سری داس کے والد کی تصویر تھی۔ وہ ایک فوجی جوان دکھائی دیتے تھے اور صرف اس وجہ سے نہیں کہ انھوں نے تلوار کی نیام والی تقریباتی وردی پہن رکھی تھی۔ ان کے چہرے پر بھی گھر کی طرح ایک مضبوط اور حکم چلانے والی شخصیت کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔

دوپہر کا کھانا کانے کے بعد سری داس نے ایک مرتبہ پھر سارا کی بات کی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا کہا ہوا ہر لفظ مجھے کیسے زخمی کر رہا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح سارا کے والدین کا دل جیتنا چاہتا تھا تاکہ اسے اپنی بیوی بنا سکے۔ سارا کے والد اسے پسند کرتے تھے۔ اس کی والدہ کو یہ رشتہ اس لیے پسند نہیں تھا کیونکہ وہ کسی وکیل یا ڈاکٹر کو اپنا داماد بنانا چاہتی تھیں۔ سری داس نے اپنی زیرک عقل کے ساتھ خود کو باریک بینیوں میں نہ ڈالا اور اپنے الفاظ کی طرح اپنے عمل میں بھی سیدھی کام کی بات کی۔ اس کی ماہانہ آمدنی پانچ ہزار روپے تھی جس میں اس کی والد کے انتقال کے بعد مزید پانچ ہزار کا اضافہ ہوجاتا۔ پہلے وہ صرف لمبے سفر پر جاتے ہوئے مغربی لباس پہننے کا عادی تھا لیکن اب اس نے خود ہمارے گاؤں میں ہونے والی شادیوں اور تقریبات میں بھی ایسا لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔

اس نے سارا سے ابھی تک کچھ نہ کہہ کر بہت دور اندیشی سے کام لیا تھا۔ وہ درحقیقت صرف ویسا خوش باش اور ادھر ادھر کی ہانکنے والا شخص نہیں تھا جیسا نظر آتا تھا۔ اگرچہ وہ بظاہر خاصا سادہ نظر آتا تھا لیکن درحقیقت وہ بہت تیز فہم اور دور اندیش تھا۔ اگر سارا نے اسے مسترد کر دیا تو اس کی امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ انکار کے بعد اس کے مزید اصرا نے صرف سارا کو ناراض کیا ہوتا۔ اس کے علاوہ بیوقوف دکھائی دیتا۔ اس کی بجائے وہ صرف سارا پر توجہ دے کر اسے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا۔ وہ کسی ایسے کسان کی مانند تھا جو کھیت تیار کر رہا ہو۔ جب سارا جواب دینے کے لیے تیار ہوگی تو وہ اپنی محبت کا بیج

بو دے گا تا کہ وہ سارا کی چاہت کی گرمی سے نشو ونما پائے۔

''اس کے والد کو مجھ پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' سری داس نے میرے ساتھ دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔''وہ میرے ابا کی بہت عزت کرتے تھے۔ ابا نے کاروبار شروع کرنے میں ان کی مدد کی تھی۔''

میں نے نہیں سوچا تھا کہ سارا کے متعلق سری داس کے جذبات اتنے شدید ہوں گے۔ مجھے احساس ہوا کہ اب تک میں نے صرف اس کے کردار کے سطحی پہلوؤں کو جانچا تھا۔

کیا مجھے اسے سارا کے لیے اپنی محبت کے متعلق بتا دینا چاہیے؟ اگر میں نے اس کے کردار کے بارے میں اپنے خیالات تبدیل کرنے نہ شروع کر دیے ہوتے تو شاید میں نے ایسا کر دیا ہوتا۔ میں اب تک اس کو ایسا انسان سمجھتا تھا جو خوشی اور غم دونوں کا ہی بہت ہیجانی ردعمل ظاہر کرتا تھا اور جو زندگی کے سنجیدہ پہلوؤں کے متعلق بالکل بھی نہیں سوچتا تھا۔

ساتواں باب

ابا کی بیماری سے میرے اندر جو صدمہ اور غم پیدا ہوا تھا وہ اب کم ہونے لگا تھا جیسے وقت کے ساتھ زخم کم تکلیف دینے لگتا ہے۔ اب میں اس ڈر سے زیادہ پریشان ہوتا تھا کہ سری داس میرے اور سارا کے درمیان آ جائے گا۔ اگر سارا کے والدین خود کو اس بات پر راضی کر لیتے ہیں کہ ان کو ہم دونوں میں سے ہی کسی کو قبول کرنا ہے تو وہ یقیناً سری داس کو ترجیح دیں گے۔ میری قسمت میں تکلیف اٹھانا لکھا تھا خواہ ابا زندہ رہتے یا نہ۔

میرے مستقبل کا سوال مجھے پریشان کرتا۔ امتحان کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں کلرک بننا چاہتا تھا۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جس کا فیصلہ میں نے اپنے لیے خود کیا تھا، سارا کے دباؤ کے نتیجے میں نہیں۔ جب میں کسی اور نوکری کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتا تو مجھے یوں لگتا کہ میرا دماغ سن ہو گیا ہے۔

سارا ہمیں ملنے زیادہ نہیں آتی تھی لیکن میں پھر بھی اس سے اکثر ملتا۔ اس نے بتایا کہ اس نے کبھی سری داس میں دلچسپی نہیں لی۔ وہ اس سے بات چیت کر کے صرف لطف اندوز ہوتی تھی اور اسے اس پیشکش کے متعلق کچھ علم نہیں تھا جو سری داس نے اس کے والدین کو کی تھی۔

''کیا مجھے سری داس کے ساتھ بات کرتا دیکھ کر تمھیں تکلیف ہوتی ہے؟'' سارا نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

سری داس منافق نہیں تھا۔ وہ مجھے دھوکا دینے کے لیے منصوبہ بندی نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال وہ سارا سے محبت کرتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے سارا کے سوال کا جواب نفی

میں دیا۔

اپنی پڑھائی کے بوجھ اور سارا کو خط، جو عموماً ان خطوں کا جواب ہوتے جو اس نے مجھے بھیجے ہوتے، لکھنے کے باعث یہ زیادہ حیرت کی بات نہیں تھی کہ میں ابا کی بیماری کو بھولنے لگا تھا۔ سارا کو خط لکھنے میں ہمیشہ خاصی دیر لگتی تھی۔ خیالات بہت آہستہ آہستہ آتے تھے۔ بعض اوقات میں نے جو کچھ لکھا ہوتا اسے پھاڑ دیتا اور دوبارہ سے لکھنا شروع کر دیتا یا غالباً صرف ایک ایسے لفظ کو بدلنے کے لیے جو مجھے پسند نہ ہوتا پورا صفحہ دوبارہ لکھتا۔ میں اس کو خط لکھنے کے معاملے میں بھی اتنا ہی کمزور تھا جتنا اس سے باتیں کرنے میں۔

ابا مجھ سے پوچھ چکے تھے کہ میں اتنے دنوں سے ان کے کمرے میں کیوں نہیں آیا۔ جب اماں نے بتایا کہ میں بہت محنت کر رہا ہوں تو وہ بظاہر بہت خوش نظر آئے۔ ندامت نے مجھے ان کے پاس جانے پر مجبور کر دیا۔ ''میں اس لیے نہیں آیا تھا کہ میں پڑھ رہا تھا۔'' میں نے انہیں بتایا۔ میں زیادہ دیر تک ان کے کمرے میں نہیں ٹھہرا۔

میں ان سے پہلے جتنی ہی محبت کرتا تھا پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ میں ان کے کمرے میں پانچ منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ میرا دماغ متضاد احساسات کا میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ جب وہ بیمار ہوئے تھے تو میں ہمدردی کے جذبے سے اتنا معمور تھا کہ ان کے بستر کے پاس سے ہلتا بھی نہیں تھا۔ مجھے تب پڑھائی کا خیال نہیں آتا تھا۔ میں اپنے کالج کے دوستوں کو بھی بھول گیا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ صرف چند ہفتوں بعد میرا دل ان کو دیکھنے اور ان کے کمرے میں جانے کو بھی نہیں چاہتا تھا؟

ان کے بیمار ہونے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہمارا گھر اور ہماری تمام دنیا بدل گئی ہے۔ والدہ اور مینکا کے چہروں نے میرے اس احساس کو تقویت پہنچائی۔ موت کا تو تصور ہی ڈرا دینے والا ہوتا ہے۔ کوئی انسان موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کس طرح دیکھ سکتا ہے؟ ابا ایسا ہی کر رہے تھے۔ وہ صرف بیمار انسان ہی نہیں تھے : وہ موت کی موجودگی میں زندہ رہنے کی جدو جہد کر رہے تھے۔ اماں اور مینکا کو اپنے احساسات چھپانے میں مشکل پیش آتی تھی۔

اب وہ کبھی کبھار آپس میں جھگڑنے بھی لگی تھیں۔ اماں کو غصہ آجاتا اور وہ مینکا

کی غلطیاں نکالتیں۔ مینکا شدید غصے میں اپنے گھر چلی جاتی لیکن وہ ہمیشہ چند ہی گھنٹے بعد پھر لوٹ آتی اور حسب سابق کام میں جت جاتی۔

انتھک محنت کے تین مہینے یقیناً اپنا اثر ظاہر کر رہے تھے۔ مینکا بعض اوقات یہاں تک کہہ دیتی: ''اب میری ہمت جواب دے گئی ہے۔'' اماں کچھ نہ کہتیں لیکن ایسے موقعے بھی آتے جب ان کا چہرہ بھی ایسی ہی کیفیت کا مظہر ہوتا۔

ان کا جھگڑا مجھے چونکا دیتا۔ اگر ابا نے سن لیا تو کیا ہوگا؟ انھوں نے اس بیماری سے عین پہلے تک بیس غالباً تیس برس تک مسلسل جان توڑ محنت کی تھی۔

میں پڑھائی سے تھک جاتا تو ایک لمحے کے لیے کھڑکی کے پاس چلا جاتا۔ ہوا مجھے تروتازہ کر دیتی۔ میری آنکھیں ہمیشہ کھڑکی کے باہر کیلے کے درختوں کے جھنڈ پر ٹھہرتیں جو گرمی کی شدت کم کر رہا ہوتا۔

ابا کی صحت یابی کی ساری امیدیں ختم ہوگئیں حتیٰ کہ اماں نے بھی پوری طرح حوصلہ ہار دیا۔ ویدامر سنگھے نے ایک دن کہا:

''ایسا لگتا ہے کہ میرے علاج سے ان کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔ بیگم صاحبہ بہتر ہوگا کہ آپ کسی اور کو آزما کر دیکھیں۔''

یہ ایسے ہی تھا جیسے وہ اماں کو بتا رہے ہوں کہ انھیں ابا کے زندہ بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آرہی۔ ایک طبیب کے لیے اس سے زیادہ افسوس ناک اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ اس کے مریض کی حالت ذرا بھی بہتر نہ ہو رہی ہو؟ ''جو چیزیں میں نے آزمائی ہیں ان سے تو لکڑی کے کسی لٹھے کو بھی کچھ نہ کچھ فرق ضرور پڑ گیا ہوتا۔'' میں نے انھیں دھرم داس سے کہتے سنا۔

دھرم داس ایک ڈاکٹر کو لے آیا۔ اس ڈاکٹر نے کہا کہ ابا کو ہسپتال لے جانا چاہیے۔ اس کے جانے کے بعد دھرم داس، مینکا اور اماں کافی دیر تک سرگوشیوں میں اس امکان پر بحث کرتے رہے کہ ابا کی بیماری ایک یا دو ہفتوں میں ٹھیک ہونے والی نہیں ہے۔ انھیں شاید ہسپتال میں تین چار مہینے رہنا پڑے گا۔ اماں اور مینکا نے ان تمام باتوں کو نہیں مانا جو دھرم داس کو اس ڈاکٹر سے معلوم ہوئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ابا کسی دن اچانک فوت

ہو جائیں گے اور ان کو کسی ایسی جگہ فوت ہونے دینا جہاں ہم ان کے بستر کے پاس نہ ہوں غلط ہوگا۔ اپنے آخری لمحات میں ہمارا ان کے بستر کے پاس ہونا ان کے لیے باعث تسکین ہوگا۔

اماں اور مینکا نے اپنے غم کو اپنے حواس پر طاری کیے بغیر دل کھول کر مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا، حتیٰ کہ انہوں نے جنازے اور اس پر اٹھنے والے اخراجات پر بھی بحث کی۔ میں ہر چیز حتیٰ کہ زندگی سے بھی بیزار ہو گیا تھا۔ ہم سب ابا سے محبت کرتے تھے اور وہ ہم سے۔ لیکن پھر بھی اب جبکہ وہ مکمل طور پر بے بس وہ لاچار تھے تو یہ محبت حتیٰ کہ رشتے داری کے بندھن بھی ان کے لیے بیکار تھے۔ زندگی اتنی بے مقصد بھی ہو سکتی ہے۔ اس آزردہ کر دینے والے انکشاف سے بچنے کا غالباً اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں ہے کہ زندگی کے معنی اور انسانی رشتے ناطوں کے متعلق سوچنے سے انکار کر دیا جائے۔ لیکن ہر کوئی ایسا بھی نہیں کر سکتا۔ میرے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا۔ ابا ابھی زندہ تھے پھر بھی ان کی بیوی اور بچے ان کے جنازے کی رسومات کے متعلق بحث کر رہے تھے! میں نے ایک عورت کے بارے میں سن رکھا تھا جس نے خود اپنا تابوت بنوایا تھا اور ایک اور شخص کے بارے میں جس نے اپنے مقبرے کی تعمیر کی نگرانی خود کی تھی۔ لیکن یہ ایک مختلف معاملہ تھا۔

ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے اماں اور مینکا کی کوئی حس انہیں خبردار کر رہی تھی کہ ابا کا اب چل چلاؤ ہے۔ انہیں اس بات کا کسی بھی ڈاکٹر سے زیادہ اندازہ ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے ابا کی بیماری کے پہلے دن سے ان کے ساتھ موجود رہ کر ان کی ہر کراہ اور آہ، ان کے سونے اور جاگنے، ان کے ہر سانس کو دیکھا تھا بلکہ اس کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔

اس تمام عرصے میں انہوں نے ٹھیک وقت پر ایک بھی کھانا نہیں کھایا۔ خواہ رات کا کوئی بھی پہر کیوں نہ ہو وہ ابا کی ضروریات کا خیال رکھنے یا انہیں دوائی دینے کے لیے بغیر کسی شکایت کے اٹھا جاتی تھیں۔ حیرت کی بات یہ نہیں تھی کہ ان پر اب تھکن کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے بلکہ یہ کہ انہوں نے اتنے لمبے عرصے تک اپنا کام ایسی انتھک لگن سے کیسے کیا تھا۔

ابا کے بیمار ہونے کے بعد ہماری گھریلو زندگی نے مجھے زندگی کے متعلق ایسی

بصیرت دی جو میں تیس برس میں بھی نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ اس تجربے نے مجھے مایوس اور افسردہ کر دیا۔ جس لگن سے اماں اور مینکا نے ابا کی تیمارداری کی تھی وہ اندھیرے میں امید کی کرن تھی۔ اور پھر سارا کے لیے میری محبت تھی۔ بدقسمتی بظاہر اس کے لیے میری محبت میں اضافہ کر دیتی تھی۔

ابا کو بیمار ہوئے ابھی دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ہمارے لیے رشتے داروں سے اپنی غربت کو چھپانا ناممکن ہوگیا۔ جب سیانیرس موداالالی نے ہمیں ادھار دینے سے انکار کیا تو اماں بہت سیخ پا ہوئیں۔ پچھلے مہینے کے دوران اس نے ہمیں دو ہزار تک کا سامان ادھار لینے دیا تھا۔ مہینہ ختم ہونے کے تین ہفتے بعد بھی ہمارے پاس اس کی رقم کی ادائیگی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

اماں نے اس کے رویے کی بہت تلخی سے شکایت کی۔ ابا نے کبھی اس سے علاج کے پیسے نہیں لیے تھے حتیٰ کہ وہ اس سے دوائیوں کے پیسے بھی نہیں لیتے تھے۔ ابا کے صاحب فراش ہوتے ہی وہ یہ سب کچھ بھول گیا۔ میرے خیال میں اسے پورا یقین ہو چکا تھا کہ ابا نہیں بچیں گے۔ اگر وہ ہمیں سات آٹھ ہزار روپے کا سامان ادھار دے دیتا تو ابا کے بعد یہ قرض کون چکاتا؟''

چونکہ وہ پکا کاروباری تھا اس لیے اسے یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ ابا اس سے علاج کے پیسے نہیں لیتے تھے۔ وہ زبردستی ابا کو ادائیگی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

وہ اپنے تمام تعلقات اور زندگی کے متعلق اپنے تمام رویوں میں پکا کاروباری تھا۔ وہ ابا کے ساتھ احسان فراموشی نہیں کر رہا تھا بلکہ خود اپنی زندگی کے تجربے کی روشنی میں صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔

ایک مہینہ قبل سری داس نے ابا پر خرچ کرنے کے لیے اماں کو تقریباً تین ہزار روپے دیے تھے۔

''اب تک میں یہ سمجھتا رہا تھا کہ چچا نے کچھ نہ کچھ بچت کی ہوگی۔'' اس نے اماں کو مزید دو ہزار روپے دیتے ہوئے کہا۔

''صرف تمہاری مدد سے ہمارا گزارہ ہو رہا ہے۔'' اماں نے رقم لیتے ہوئے کہا۔

جوں جوں چودہ دسمبر قریب آ رہی تھی میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے امتحان میں پاس ہونے کے امکانات سے زیادہ مستقبل کے متعلق سوچتا ہوں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں پاس ہو جاؤں گا۔ میں نے صرف وہ اسباق دہرانے کی کوشش کی جو میں نے زیادہ احتیاط سے نہیں پڑھے تھے۔ میرے استاد نے مجھے بتایا تھا کہ ممکنہ سوالات کے جواب تیار کرنا وقت کا ضیاع ہوتا ہے لہٰذا میں نے اپنے تمام مضامین کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں بہت اعتماد سے امتحان دے سکتا ہوں۔

میں نے اپنا لیمپ بجھایا اور کھڑکی بند کرنے کے لیے اٹھا۔ تاریکی اتنی شدید تھی کہ میں اپنی کھڑکی کے باہر مانوس کیلے کا جھنڈ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب میں کھڑکی بند کرنے اور لیمپ بجھانے کے بعد بستر پر لیٹا تو میرے خیالات اور جذبات ایک ایسی نیند میں تبدیل ہو گئے جو صرف طلوع سحر کے وقت کوؤں کی کائیں کائیں سے ٹوٹی۔ میں نے کھڑکی کے اوپر لگے ہوئے روشندان سے آتی نرم روشنی کو دیکھا۔

پچھلی رات کو سوچوں نے دوبارہ میرے دماغ میں چکر لگانا شروع کر دیے۔ میں نے اپنا لیمپ جلایا اور پڑھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ میں نے اپنی آنکھیں اپنے سامنے والے صفحے پر مرکوز رکھیں لیکن میرے دماغ نے ایک موضوع پر ٹکے رہنے سے انکار کر دیا۔ میں نے بے صبری سے لیمپ بجھایا اور باہر چلا گیا۔ مینکا برآمدے میں کھڑی سڑک کو تک رہی تھی۔

''میں دھرم داس کا اانتظار کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ اس نے بیل گاڑی کی آواز سنی اور سیڑھیاں اتر کر باغ میں چلی گئی۔ لیکن وہ کوئی اور بیل گاڑی تھی جس میں دو آدمی ریلوے سٹیشن جا رہے تھے۔

''ابا کی حالت کچھ خراب ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہمیں دھرم داس کو کسی ڈاکٹر یا کسی اور وید کو بلانے کے لیے بھیجنا چاہیے۔ میں نے مالس کو بیل گاڑی میں اسے لانے کے لیے بھیجا ہے۔''

''اگر تم چاہتی ہو کہ کوئی ڈاکٹر آئے تو فوراً کسی نہ کسی کو لا سکتا ہوں۔''

''دھرم داس کے یہاں آنے پر ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کسی ڈاکٹر کو بلائیں یا کسی

وید کو۔ پچھلی مرتبہ ڈاکٹر ابا کو ہسپتال بھیجنا چاہتا تھا۔ میرا نہیں خیال کہ ڈاکٹر کو بلانے کا کوئی فائدہ ہے۔ اب ناراض مت ہونا۔ ابا نے تین مہینے تکلیف سہی ہے۔''

میں نے محسوس کر لیا کہ مینکا واضح الفاظ میں یہ نہیں کہنا چاہتی کہ ابا کا آخری وقت قریب ہے۔ غالباً اس کے دماغ میں یہ تھا کہ پچھلے تین مہینوں کے دوران ابا کی تیمارداری کے سلسلے میں ہماری تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ لیکن وہ خود کو کھلم کھلا کیسا کہنے پر آمادہ کر سکی لہٰذا وہ بالواسطہ کہہ رہی تھی۔ اس کے لیے زندگی پوری طرح عملی تجربے اور رسم و رواج کا معاملہ تھی۔ وہ خود کو اس سلسلے میں پریشان نہیں کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ابا اب بچیں گے نہیں۔ میری طرح یقیناً اسے بھی خیال آیا ہوگا کہ تکلیف اٹھاتے رہنے کی بجائے ابا کے لیے بہتر ہے کہ وہ خالق حقیقی سے جاملیں۔ ہم ان سے زیادہ اپنے متعلق سوچ رہے تھے۔

آٹھواں باب

ابا کے انتقال کے دو برس کے اندر میری زندگی میں ایک بالکل غیر متوقع تبدیلی آ گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ میری یہ حالت میری بے عملی کا نتیجہ ہے کیونکہ عام پر یہ تصور کیا جاتا تھا کہ میں ایک غیر سنجیدگی شخص ہوں جو اپنی پڑھائی کے سوا کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں خود اسے اس طرح نہیں دیکھتا۔ میری زندگی تمام پیش بینیوں کے برعکس بتدریج اور مکمل طور پر تبدیل ہوئی اور اس سے بھی پہلے کہ میں خود اس تبدیلی سے آگاہ ہوسکتا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میرے اندر رسم و رواج کی خلاف ورزی کرنے کی طاقت اور حوصلہ نہیں تھا۔ اپنے خیالوں میں میں خود کو ایک ہیرو کی طرح دیکھتا جو بڑی ثابت قدمی سے رسم و رواج کے خلاف مزاحمت کر رہا ہوتا لیکن جب میدان عمل میں کودنے کا وقت آتا اور یہ دکھانے کا موقع ہوتا کہ میں کیا کرسکتا ہوں تو میری طاقت جواب دے جاتی اور جذبات میری قوت فیصلہ پر غالب آجاتے۔ لہٰذا رسم و رواج ہمیشہ جیت جاتے۔

ابا کی وفات بہت ہی غیر متوقع طریقے سے ہوئی۔ ہمارے اصرار پر وید امر سنگھے ہی ابا کا علاج کرتے رہے۔ لیکن یہ واضح تھا کہ ان کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ پھر میرے اعزاز کے ساتھ امتحان پاس کرنے کی خبر نے بظاہر انہیں نئی زندگی دی۔ ان کی خوشی بہت قابل رحم تھی۔ وہ بالکل موت کے دہانے پر کھڑے اس تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

مینکا نے ایک صبح ان کو نیند میں مردہ حالت میں پایا۔ اس نے دیکھا کہ ان کا انتقال ہوئے تین چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ سب سے پہلے بیدار ہوتی تھی اور اسی نے اماں

کو ابا کے کمرے میں بلایا۔ اماں اور اس نے آنسوؤں کے درمیان مایوسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

انہوں نے تین مہینے سے زیادہ عرصے تک بخوشی بغیر شکایت کیے جان توڑ محنت کی تھی اور پھر بھی وہ ایک دوسرے کی طرف ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے ان سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ ان کا قصور نہیں ہے اور انہوں نے اپنی سی کوشش کی ہے۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ لوگ انہیں ہی موردالزام ٹھہرائیں گے: ''انہیں پتا چلنے سے گھنٹوں قبل مریض کا انتقال ہو چکا تھا۔''

یہ رسم و رواج ہی ہیں جو ہمیں محض کٹھ پتلی بنا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ موت اور کوئی آفت بھی ہمیں اتنا خوفزدہ اور بے بس محسوس کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔

ایک برس کے اندر اماں اور مینکا میں بول چال بند ہو گئی۔ ایک دن مینکا ناریل کے دو درختوں کے تمام پھل لے گئی۔ پھر ایک روز وہ کاس کے ایک یا دو دانے لے گئی۔

''میرا خیال ہے میں یہ لیمپ لے جاؤں۔ یہ مجھے ابا کو یاد رکھنے میں مدد دے گا۔'' ایک دن اس نے ناریل کے تیل سے جلنے والا پیتل کا ایک خوبصورت لیمپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

اماں کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ غالباً شرمندگی کی وجہ سے مینکا نے لیمپ واپس رکھ دیا۔

''تم یہ لیمپ نہیں لے جاؤ گی۔'' اماں غصے سے کہا۔ ''سری داس نے تمہارے باپ کی بیماری پر پانچ ہزار روپے سے زیادہ خرچ کیے تھے۔''

مینکا جس موقعے کی تلاش میں تھی وہ اسے مل گیا۔ اس کی شرمندگی غائب ہو گئی اور وہ بھی غصے کا اظہار کرنے لگی۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ ہم نے بھی ابا پر تین ہزار روپے سے زیادہ خرچ کیے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''اس نے خود بھی پچھلے تین مہینوں کے دوران آرام نہیں کیا۔'' میں نے مزید کہا۔

مجھے یقین ہے کہ اماں صرف لیمپ کے لیے نہیں جھگڑ رہی تھیں۔ وہ ان کے لیے بیکار تھا۔ اسے مینکا کی شادی کے بعد ابا کے جنازے تک کبھی نہیں جلایا گیا تھا۔ اماں کے

غصے کی وجہ زیادہ شدید تھی۔ اب وہ بالکل قلاش ہو چکی تھیں۔ میں نے ان کو کہتے سنا تھا کہ گھر اور زمین دونوں ہی رہن تھے۔ ابا نے مینکا کو اچھا جہیز دیا تھا۔تیس ہزار روپے تو صرف نقدی ہی تھی۔ انہوں نے مجھے تعلیم دلوائی تھی۔لیکن انہوں نے اماں کے مستقبل کے بارے میں بالکل نہیں سوچا تھا۔ان کے پاس پریشان اور ناراض ہونے کی اچھی خاصی وجہ تھی۔

وہ دونوں اب رو رہی تھیں۔مینکا دوڑتی ہوئی باہر گئی اور بیل گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سری مل اس کے پیچھے جا رہا تھا جب اماں نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر دوبارہ نیچے اتار دیا۔

مینکا ہم سے دوبارہ ملنے چار مہینے بعد آئی۔ وہ دھرم داس کو ساتھ لائی تھی۔ اس کے پاس ہمیں دکھانے کے لیے ایک دستاویز تھی۔ جب اماں نے اسے دیکھا تو وہ بہت ناراض ہوئیں لیکن مینکا نے نرمی اور مروت سے بات کی۔ جب میں نے یہ محسوس کیا اور دیکھا کہ مینکا تو غمگین بھی دکھائی دے رہی ہے تو میں یہ خیال کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اماں کا طیش بلا وجہ ہے۔

وہ دستاویز ابا نے دھرم داس کے حق میں تیار کروائی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے وہ نہ ختم ہونے والی مقدمے بازی یاد آ گئی جو دیہاتی لوگوں میں زمین کے سلسلے میں ہوتی ہے۔ زمین کے تنازعے کی وجہ سے اینڈریس مودالالی خود اپنے بھائی کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ دیہاتی لوگوں کے لیے زمین ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ وہ صبح سے لے کر رات تک حتیٰ کہ سوتے وقت بھی اس کے متعلق سوچتے ہیں۔

''تمہارے والد نے تقریباً دو برس پہلے مجھے بتایا تو تھا کہ وہ گھر اور جائیداد دھرم داس کے نام لکھ رہے ہیں لیکن انہوں نے ایسا صرف حفاظت کے نقطہ نظر سے گیا تھا۔'' اماں بے کلی سے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اماں، ایسا صرف حفاظت کے نقطہ نظر سے نہیں ہوا تھا۔'' مینکا نے کہا۔''ابا نے دھرم داس سے تیس ہزار روپے ادھا لیے تھے۔ دستاویز میں چالیس ہزار روپے لکھے ہیں کیونکہ گھر کی اصل کی قیمت یہی ہے۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایسا بالکل نہیں ہوسکتا۔تمہارے والد کبھی کبھار دھرم داس سے

چھوٹی موٹی رقم ضرور ادھار لیا کرتے تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ مل کر بھی دس ہزار روپے سے زیادہ نہیں بنیں گے۔ انہوں نے یہ دستاویز اس آدمی کے خوف سے لکھوائی تھی جس سے انہوں نے بیس ہزار روپے قرض لے رکھے تھے۔ انہوں نے یہ گھر اور زمین اس لیے دھرم داس کے نام کیے تھے کہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں وہ شخص ان پر دعویٰ نہ کر دے۔''

''اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو انہوں نے جائیداد یقیناً میرے نام لکھی ہوتی۔'' مینکا نے دستاویز کھولی۔ ''جس شخص نے ابا کو بیس ہزار روپے ادھار دیے تھے وہ دھرم داس ہی تھا۔ اور پھر ہمیں ان تمام چھوٹے موٹے قرضوں کو بھی جمع کرنا ہے۔ دھرم داس آپ کو بتا سکتا ہے کہ وہ سب مل کر کتنا بنتے ہیں۔'' اس نے دھرم داس کی طرف دیکھا۔

''تیس ہزار روپے سے کم تو کسی طرح بھی نہیں۔'' دھرم داس نے کہا۔ ''لیکن میں نے صرف بیس ہزار کا اندراج کیا تھا، دوسری رقوم نہیں لکھی تھیں۔''

میں اندر سے ابل رہا تھا۔ میں نے اپنا غصہ مالس پر اتارا:

''گدھے! تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ ہماری باتیں سن رہے ہو؟'' حالانکہ وہ حقیقتاً ہم سے خاصا دور تھا۔

''اروندا، ناراض مت ہو۔'' مینکا نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہم تمہیں یا اماں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تمہیں اس دستاویز کا پتا چل جائے۔ ابا کی بیماری کے دوران سری داس نے ہماری جو مدد کی تھی اس کی وجہ سے اماں اس دن تعریفیں کرکے اسے آسمان پر چڑھا رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ پر کچھ نہ کرنے کا الزام تھوپا۔ آخر کار تمہیں اس دستاویز کا علم ہونا چاہیے۔ لیکن تم اور اماں جب تک زندہ ہو یہاں رہ سکتے ہو۔''

''اگر یہ گھر تمہاری ملکیت ہے تو پھر ہم یہاں پر کیوں رہیں؟'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

ابا ایک اچھے انسان تھے۔ وہ بیوقوف بالکل نہیں تھے۔ اگر وہ اپنی جائیداد چالیس ہزار روپے کی بیچ سکتے تھے تو انہوں نے اسے دھرم داس کے نام کیوں منتقل کیا؟ کیا وہ ایسے آدمی تھے جو صرف اپنے قرض خواہوں کو دھوکہ دینے کے لیے غلط دستاویز بنواتے ہیں؟ اماں

بھی اس بات کو مانتی تھیں کہ ابا نے دھرم داس سے تقریباً دس ہزار روپے قرض لیے تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ انہیں ایک اور شخص کے بیس ہزار روپے دینے تھے۔ ابا نے یقیناً دھرم داس سے پیسے لے کر اس شخص کا قرضہ اتار دیا ہوگا۔ تو پھر مینکا نے جب یہ معاملہ اٹھایا اور ہمیں دستاویز دکھائی تو ہم اتنا برہم کیوں ہوئے؟

ہمارے علاقے میں ایک وثیقہ نویس تھا جو مشکل سے سنہالی میں اپنے دستخط کر سکتا تھا۔ ساری دستاویزیں اس کا منشی ہی لکھا کرتا تھا۔ مشہور لوگوں نے بھی بعض اوقات اپنے لیے جعلی دستاویزیں بنوانے کے لیے اس قسم کے وثیقہ نویس رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن دھرم داس ایسا شخص نہیں تھا جو اس طرح کی حرکت کرتا۔ اس کے علاوہ وقت بدل چکا تھا۔ اب مزید اس طرح کا کوئی کام کرنا آسان نہیں تھا۔

''دھرم داس، کیا تم نے ابا کو بیس ہزار روپے ادھار دیے تھے؟'' میں نے سختی سے پوچھا۔

''ہاں، اروندا۔'' مینکا نے جواب دیا۔

''میں یہ دھرم داس سے سننا چاہتا ہوں تم سے نہیں۔''

''جب میں نے انہیں بیس ہزار روپے دیے تو میں نے اپنی ڈائری میں لکھ لیا۔ باقی کے دس ہزار چھوٹی چھوٹی رقموں کی صورت میں تھے جو انہوں نے مجھ سے مشکل حالات میں ادھار لیے۔ میں نے ان سب کا حساب نہیں لکھا۔ صرف ایک جگہ ساڑھے چھ ہزار روپے کا لکھا ہوا ہے۔ مینکا کو تمام تفصیلات کا علم ہے۔ یہ کوئی بھی حساب اپنے دماغ میں رکھ سکتی ہے۔''

ابا کو رقم کی ضرورت کس لیے پڑی؟ وہ ہماری تمام ضرورتوں کے لیے کافی کما لیتے تھے۔ وہ نئے سال کے موقعے کے علاوہ نہ ہی شراب نوشی کرتے تھے اور نہ ہی اپنے دوستوں کے ساتھ جوا کھیلتے تھے۔ وہ اپنے پیشے میں اتنے زیادہ منہمک تھے کہ یہی ان کی تفریح بھی تھا۔

انہوں نے مینکا کی شادی پر دل کھول کر خرچہ کیا تھا۔ کم از کم چار پانچ ہزار روپے تو صرف اس عارضی نمائشی عمارت پر خرچ ہوئے تھے جو ان خوبصورت برجوں والی عمارتوں

جیسی دکھائی دیتی تھی جو مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ استقبالیہ محراب پر ان کا یقیناً کوئی خرچہ نہیں ہوا تھا کیونکہ یہ لوگوں نے ان کے لیے تعمیر کی تھی۔ مقامی شخصیات جو شادی میں آئیں انہیں پر تکلف دعوت دی گئی۔ درحقیقت یہی وہ چیز تھی جس سے انہیں دلی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ بعد میں وہ کسی دوست یا رشتے دار کو یہ بتاتے ہوئے خوشی سے پھولے نہ سماتے: ''رتنا جیواوسالا مودالی اور ڈسٹرکٹ جج یا تیسینا نے شادی میں آکر میری عزت افزائی کی۔'' ہم رتنا جیوا مودالی اور ڈسٹرکٹ جج کی کم و بیش اتنی عزت کرتے تھے جیسے وہ شاہی مہمان ہوں۔

شادی سے چار پانچ دن پہلے ابا نے مختلف رنگ رلیوں پر پیسے لٹانے شروع کر دیے تھے۔ گھر میں ہر وقت تعمیراتی سامان، سبزیاں، دہی، شہد وغیرہ لانے کا شور مچا رہتا تھا۔ ہم ہر وقت اپنے نا آمادہ دوستوں اور رشتے داروں سے میزیں، کرسیاں، دیگچے اور برتن لانے میں مصروف رہتے تھے۔ کچھ جگہوں پر ہمیں خاصی منت سماجت بھی کرنی پڑی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد ہمیں ہر چیز ایک مرتبہ پھر واپس لے جانا پڑی۔ ان مصروف دنوں کے دوران ہر کھانے پر تقریباً بیس لوگ موجود ہوتے تھے۔

مینکا کا عروسی جوڑا ایلان گرانجس (ایک ادھیڑ عمر غیر شادی شدہ عورت اور اس کی بہن جو اپنے وقت کے ایک اہم خاندان کی واحد باقیات تھیں) نے تیار کیا۔ اس خاندان کی کئی پیڑھیوں نے مغربی طور پر طریقوں کی مسرفانہ نقل کر کے خود کو کنگال کر لیا تھا۔ ''وہ لباس تیار کرنے کا کوئی معاوضہ نہیں لیں گی۔'' ابا نے اپنا سر ہلاتے ہوئے اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں مارتے ہوئے کہا تھا، تاکہ اپنی ستائش پر زور دے سکیں۔ ''کتنا خوبصورت عروسی جوڑا ہے۔ خاصا بنا انداز ہے۔'' ہماری خاتون مہمانوں نے ابا کی طرف مزید عزت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت ابا کی حالت ایک ایسے فاتح جرنیل جیسی تھی جو اپنے گھوڑے پر میدان جنگ کا جائزہ لے رہا ہو۔

جب دھرم داس اور اس کے ساتھ آنے والے باراتی دلہن کو لے کر چلے گئے تو ابا نے اپنے خاندان اور دوستوں کو شاندار کھانا کھلایا۔

اب میں سمجھ سکتا تھا۔ ابا ادھار لیے بغیر اس سب کی ادائیگی نہیں کر سکتے تھے۔

اگرچہ شادی پر ملنے والے تحائف میں عموماً اچھی خاصی رقم بھی ہوتی ہے لیکن وہ سب بھی خرچ ہوگئی ہوگی۔ بعد میں انھوں نے یقیناً ان قرضوں کو چکانے کے لیے دھرم داس سے تیس ہزار روپے مانگے ہوں گے۔ اور وہ اتنے ایماندار تھے کہ لوگوں نے انہیں یہ ساری رقم بغیر کسی ضمانت کے دے دی ہوگی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ دستاویز اس طرح ہی تیار ہوئی ہوگی۔

اماں مینکا اور ابا دونوں سے اتنی نالاں تھیں کہ ان کے لیے ان سب چیزوں کے متعلق سوچنا ناممکن تھا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ گھر ہم میں سے کسی کی ملکیت ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ آپ لوگ اپنی تمام زندگی یہاں رہ سکتے ہیں۔'' مینکا نے منت بھرے لہجے میں بسورتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ شدید عاجزی کا اظہار کر رہا تھا۔

''ہم سب جائداد سے کتنی محبت کرتے ہیں! اور پھر بھی ہمیں ہمیشہ بتایا جاتا ہے کہ ہم مرتے وقت اسے ساتھ نہیں لے جا سکتے!'' میں نے ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

دو کسان اپنے بیلچے اٹھائے آہستہ آہستہ کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ وہ دروازے کی طرف دیکھنے کے لیے ہمارے گھر کے پاس رکے اور دوبارہ چل پڑے۔ انہوں نے ایسا خالصتاً عادت سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ وہ ابا کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اگر ابا برآمدے میں موجود ہوتے تو انہوں نے گپ شپ اور پان کھانے کے لیے اندر بلا لیا ہوتا۔ ابا کو فوت ہوئے اب تقریباً ایک برس ہو چکا تھا لیکن وہ کسان جب بھی ہمارے گھر کے پاس سے گزرتے تھے ان کی آنکھیں اب بھی خود بخود اس طرف مڑ جاتی تھیں۔

میرا دل چاہا کہ ابا کی اس روایت پر عمل کروں۔ میں نے انہیں آواز دی۔ انہوں نے اپنے بیلچے باغ میں چھوڑے اور برآمدے میں آ گئے۔

''آؤ، بیٹھو۔'' میں نے کہا۔

انہوں نے جواب میں صرف مجھے گھورا۔

''بیٹھ جاؤ!''

میں ان کے لیے پاندان لے آیا۔ وہ تمام وقت مجھے تیکھی نظروں سے گھورتے

رہے۔

''لوٹا!''

اماں، مینکا اور دھرم داس اندر چلے گئے۔

ان دونوں نے اپنے لیے پان خود تیار کیے۔ اسے کھانے سے پہلے ان میں سے ایک نے ابا کے گن گانے شروع کر دیے: ''آپ کے والد جیسا انسان......'' میں نے اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی موضوع بدل دیا:

''کیا تم لوگوں کے پاس پیسہ ہے؟''

انہوں نے مایوسی سے میری طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کیا تم لوگ پیسے بچاتے ہو؟''

''ہمیں کھیتوں سے بہت کم آمدنی ہوتی ہے، صرف گزارے جتنی......میں وید جی کا دوسو روپے کا مقروض ہوں......''

''اور مجھے ان کے ڈھائی سو دینے ہیں۔'' دوسرے نے کہا۔

انہوں نے یقیناً یہ سوچا ہوگا کہ میں نے ان کو پھنسانے کے لیے جال بچھایا ہے۔

جب میں نے ان کے قرضوں کے متعلق کوئی بھی بات نہ کی تو وہ خاصے متذبذب نظر آنے لگے۔

''جناب، اگر آپ کبھی کوئی کام کروانا چاہیں تو مجھے بلا لیں۔'' ان میں سے ایک نے اپنا بیلچہ کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ دوسرے نے جانے سے پہلے مجھے صرف خاموشی سے تشکر بھرے انداز میں دیکھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک خاموش، وفادار اور خطرناک کتا یاد آ گیا جو میرے کہنے پر کسی بھی انسان کو کاٹ سکتا تھا۔

نواں باب

میں نے کلیریکل سروس کا امتحان دیا اور جلد ہی سرکاری کلرک بھرتی ہوگیا۔ میں نے اماں کو پیشکش کی کہ اب وہ میرے گھر آجائیں۔ انھوں نے مینکا کے ساتھ شدید جھگڑے کے بعد پرانا گھر چھوڑ دیا تھا اوراپنی ایک کزن کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ انھوں نے میری تجویز پر غور کرنے سے بھی انکار کردیا۔ صدمے نے انہیں اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ گھر اور زمین دھرم داس کے نام لکھ کر ابا نے ان کے مستقبل کی بالکل فکرنہیں کی تھی۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں ان کا نقطہ نظر درست تھا۔ ابا دھرم داس کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ دھرم داس اس وقت تک اماں کو اس گھر میں رہنے دے گا جب تک ان کی خواہش ہوگی۔ بہرحال میرے پاس ناراض ہونے کا ان سے کہیں زیادہ جواز تھا کیونکہ ابا کی جائیداد کا حقیقی وارث تو میں تھا۔

لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اماں نے میری بات سننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مینکا نے زمین کی ملکیت کی بات کر کے معاملات کو مزید بگاڑ دیا تھا۔ اماں نے محسوس کیا کہ اگر انھوں نے اس گھر میں مزید قیام کیا تو ان کی حیثیت محض ایک چوکیدار سے زیادہ نہیں ہوگی۔

انھوں نے اپنی تمام چیزیں (اپنے کپڑے، الماری، پیتل اورتانبے کے بہت سے چھوٹے موٹے زیورات) سمیٹیں اور انہیں لے کر اپنی کزن کے گھر چلی گئیں۔ مینکا رونے

لگی: ''آپ عمر بھر یہاں رہ سکتی ہیں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ اماں نے جواب میں ایک مرتبہ پھر اسے ڈانٹ پلائی۔ پرانا گھر چھوڑتے ہوئے انہوں نے ایک آنسو نہ بہایا۔ ''مجھے دوبارہ اماں کہنے کی جرات مت کرنا!'' انہوں نے مینکا سے کہا۔

مینکا اور اس کا خاندان اسی مہینے وہاں منتقل ہو گیا۔ اس نے اپنی خوشی چھپانے کی کوشش نہ کی۔ پھر بھی بعد ازاں کافی عرصے تک شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرتا جس میں وہ اماں کے فیصلے پر آنسو نہ بہاتی۔

''وہ کیوں چلی گئیں؟ اگر وہ ہمارے ساتھ یہاں ہوتیں تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ ہوتا! اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ گھر کا مالک کون ہے؟''

جو کچھ ہوا تھا اس سے وہ خاصی پریشان تھی۔

سارا اب شاذونادر ہی ہمارے گھر آتی تھی۔ درحقیقت مجھے اس سے ملنے کا بہت کم موقع ملتا کیونکہ اب میں کالج سے فارغ ہو چکا تھا۔ اگر میں سارا سے ملنے اس کے گھر جاتا رہتا تو یہ بات اس کی والدہ کو بالکل پسند نہ آتی۔

میرے لیے سارا کے جذبات میں اب بہت زیادہ شدت آ گئی تھی۔ جب ہماری ملاقات نہ ہوتی تو وہ مجھے خط لکھتی۔ اس کی والدہ نے اس کی شادی سری من نامی ایک وکیل سے کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن اس کے والد کو وہ شخص کچھ خاص پسند نہیں تھا۔ انہیں وکلاء ویسے ہی ناپسند تھے۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا۔

''اپنے والدین کو اس بات پر راضی کرو کہ چیزوں کو تمہاری نظر سے دیکھیں۔'' میں نے کہا۔

اگرچہ یہ بالکل واضح تھا کہ سارا مستقبل کے بارے میں بے صبری ہو رہی تھی لیکن میں پھر بھی اس کے ساتھ اپنی اگلی ملاقات سے آگے نہیں دیکھتا تھا۔ اس سے بات چیت کرنے اور اس کی محبت کے خواب دیکھنے کی خوشی میرے لیے کافی تھی۔ سارا کو یہ خوف کھائے جاتا تھا کہ اس کی شادی کسی اور آدمی کے ساتھ ہو جائے گی۔ میں اس کے محسوسات

کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ میں مستقبل کے متعلق سوچنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔

''اماں اپنے فیصلے کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔''

''تمہیں کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کرو۔''

اس کے چہرے پر غصے کی چنگاری نظر آئی۔

''مجھے نہیں پرواہ کہ وہ راضی ہوتی ہیں یا نہیں۔ ان کی خواہشات جائیں بھاڑ میں۔ تو وہی کروں گی جو مجھے پسند ہوگا!''

جس بے باکی سے اس نے یہ کہا اس نے مجھے چونکا دیا۔ جب میں نے کہا: ''کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کرو۔'' تو میں نے اپنے الفاظ کو بالکل نہیں تولا تھا۔ میرے دماغ میں جو آیا میں نے کہہ دیا تھا۔ لیکن سارا کی بات سے ایسے لگتا تھا کہ اس نے بہت غور وخوض کے بعد فیصلہ کیا تھا۔ اس کی والدہ مجھے قبول نہیں کریں گی۔ اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ جب اس نے یہ کہا: ''ان کی خواہشات جائیں بھاڑ میں ۔ میں تو وہی کروں گی جو مجھے پسند ہوگا!'' تو کیا وہ بغاوت پر آمادہ تھی؟ میں اسے تسلی دینے کے لیے کچھ کہنے کے متعلق نہ سوچ سکا۔

کاش میں اس سلسلے میں سری داس سے مشورہ کر سکتا! مجھے اسے بتا دینا چاہیے تھا کہ میں بہت پہلے سے سارا سے محبت کرتا ہوں حتیٰ کہ تبھی جب اس نے مجھے سارا کے لیے اپنے جذبات سے آگاہ کیا تھا۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ سوچے گا کہ میں اس کے اور سارا کے درمیان حائل ہو گیا ہوں۔ اپنے جذبات کو چھپا کر میں نے کتنی بیوقوفی اور منافقت کا ثبوت دیا تھا! اگر میں نے سری داس کو صاف صاف بتا دیا ہوتا تو اس نے یقیناً سارا کو بھلانے کی پوری کوشش کی ہوتی۔

''ابا کو وہ وکیل پسند نہیں ہے۔'' سارا نے کہا۔

''کیا میں تمہارے والد سے بات کروں؟''

''نہیں۔''

''تو کیا پھر میں مینکا سے کہوں کہ وہ ان سے بات کرے؟''

''نہیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''غالباً وہ اس وکیل کو اس لیے پسند نہیں کرتے کیونکہ ہو جانتے ہیں کہ تم مجھے چاہتی ہو۔''

''نہیں!'' وہ مسکرائی۔

''پھر وہ اسے پسند کیوں نہیں کرتے؟''

اس نے قریب لگے ہوئے ناریل کے ایک چھوٹے درخت کے ایک پتے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اس کی نوک کو چبایا اور تھوک دیا۔ پتا جھولتا ہوا واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔ میرے سوال نے بظاہر اسے پریشان کر دیا تھا۔

''ابا سری داس کو پسند کرتے ہیں۔'' اس نے آخر کار بہت کوشش کر کے کہا۔ اس دوران اس نے اپنا چہرہ مجھ سے موڑے رکھا۔

میں جانتا تھا کہ سارا کے والد کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ میں ان کا داماد بنوں۔ وہ ایسا کر بھی کیسے سکتے تھے؟ میں نے ابا کی وفات، اپنی غربت، اماں اور مینکا کے درمیان ہونے والے جھگڑے اور پرانے گھر سے اماں کی بے دخلی کے متعلق سوچا۔ ان باتوں کو چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔

سارا کے والد ہمارے متعلق سب کچھ جانتے تھے۔

میں کہنے کے لیے کچھ نہ سوچ سکا۔ ''لیکن تم تو سری داس میں دلچسپی نہیں رکھتیں نا؟'' میں نے آخر کار پوچھ لیا۔

''تم اس کا جواب جانتے ہو!'' اس نے ترشی سے کہا۔

''سارا، ناراض کیوں ہوتی ہو۔'' یہ الفاظ میری زبان سے پھسل گئے۔

سارا مسکرائی۔ ''اروندا، تم اب کتنا کما لیتے ہو؟''

''مجھے ساڑھے آٹھ سو ملتے ہیں۔''

''تم تقریباً ڈیڑھ سو روپے میں گھر کرائے پر لے سکتے ہو، کیوں؟ اور مجھے یقین ہے کہ گھر داری پر مزید چار سو روپے سے زیادہ نہیں اٹھیں گے۔''

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔

''تم اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہو۔ تمہیں صرف ساڑھے آٹھ سو روپے میں گزاراہ کرنے کے متعلق سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''مجھے اپنے والدین کی ضرورت ہے لیکن ان کے پیسے کی نہیں۔'' وہ اعتماد سے بات کر رہی تھی۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے ابا پیسہ کمانے کے لیے اتنی جان کیوں مارتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ اماں اور مجھ سے محبت کرتے ہیں اور پھر بھی وہ کبھی ایک دن گھر پر ہمارے ساتھ گزارنے کا نہیں سوچتے۔ مجھے کبھی ان سے اطمینان سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا حتیٰ کہ چند منٹ کے لیے بھی۔''

''میرا اندازہ ہے کہ انہیں پیسہ کمانے میں لطف آتا ہے۔ میرے ابا زندگی میں جتنا لطف حاصل کرنا چاہتے تھے وہ انہیں دیہات میں ہر طرف گھوم پھر کر اپنے مریضوں کا علاج کرنے میں مل جاتا تھا۔ وہ ہر وقت باہر ہوتے تھے خواہ بارش ہو یا دھوپ حتیٰ کہ اندھیرے میں بھی۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ اس آدمی کو ہر روز دن بھر اپنے کندھوں پر سامان اٹھانے میں لطف آتا ہے؟'' اس نے سڑک پر سے گزرتے ہوئے ایک مزدور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اس سے روزی روٹی کماتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے یہ کام پسند ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ کام کب کا چھوڑ چکا ہوتا۔''

سارا میری بات نہیں سن رہی تھی۔

''اماں مختلف ہیں۔ انہیں اچھا لباس پہننے، سفر کرنے اور بڑے لوگوں کے ساتھ میل جول بڑھانے کا شوق ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''یہ میری سمجھ میں آتا ہے۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتی تو میں بھی بالکل ایسا ہی کرتی۔ بعض اوقات وہ مجھ سے باتیں کر کے واقعی لطف اندوز ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار ان کا رویہ درشت بھی ہوتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے ہم آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ ابا کے ساتھ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ حتیٰ کہ اگر کبھی مجھ سے کوئی

بات کہنی بھی ہو، اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، تو وہ خوشی یا غصے یا کسی بھی جذبے کا اظہار نہیں کرتے۔ بہت آسانی سے پتا چل جاتا ہے کہ ان کا دماغ کسی اور مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔ انہوں نے کبھی ایک وقت میں مجھ سے تین یا چار سے زیادہ الفاظ نہیں کہے۔''

اب اس کی جھنجھلاہٹ کی وجہ میری سمجھ میں آئی۔ غالباً وہ اس لیے برہم تھی کہ اسے اپنے والد سے میرے متعلق بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

''میں خود تمہارے والد سے بات کر سکتا ہوں۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر تجویز پیش کی۔

''نہیں۔'' اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ میری طفلانہ سوچوں کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔

''اگر ابا اپنی خواہشات کے خلاف کوئی کام کرنے پر راضی ہو بھی گئے تو وہ ویسا ہی کریں گے جیسا اماں چاہیں گی۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''ہم تمہاری والدہ کو کیسے راضی کر سکتے ہیں؟'' میں نے اس سے زیادہ اپنے آپ سے پوچھا۔

''ایسا کسی بھی طرح ممکن نہیں۔ اور اگر انہوں نے سری داس کو پسند کرنا شروع کر دیا تو کیا ہوگا؟''

سارا جانتی تھی کہ سری داس اس کی والدہ کی رضا مندی حاصل کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔

''لیکن اگر تم خود اسے ناپسند کرتی ہو تو؟''

''اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''تم نے ایسا کیوں کہا؟ اگر تم یہ کہو گی کہ تم سری داس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو وہ یقیناً تمہاری بات سنیں گے۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔

''اگر میں چاہوں تو یہ بات سو مرتبہ کہہ سکتی ہوں۔ بات یہ نہیں ہے۔ اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیا ایسا کرنے سے وہ تمہیں قبول کر لیں گے؟ کیا تم نے کبھی

میرے والد سے بات کرنے کے علاوہ کسی اور طریقے کے بارے میں سوچا ہے؟''

وہ میرے ساتھ خاصی بے صبری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس سب کے پیچھے کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔

''اگر ابا نے تمہیں قبول نہ کیا تو پھر تم کیا کرو گے؟''

''میں کوشش کروں گا کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح پسند کرنے لگیں۔''

''تم ابھی تک ابا کی احمقانہ پسند اور ناپسند میں پھنسے ہوئے ہو! میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ اگر ہم نے سب کچھ آزما لیا اور ناکام ہو گئے تو پھر ہم کیا کریں گے؟''

''تو پھر ہم کیا کریں گے؟'' میں نے دہرایا۔

یہ خیال کہ سارا کے والدین کی اجازت ضروری ہو گی کسی ایسے پنجرے کی مانند تھا جس میں قید میں بے سودا اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔

''اروندا، تم گھر جاؤ اس اس معاملے کے بارے میں سوچو!'' بظاہر اس کا غصہ غائب ہو چکا تھا۔ واپس جاتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی والدہ برآمدے میں نمودار ہو چکی تھیں۔

میری سوچیں بظاہر ہل چلے کھیت میں دھان کی مانند بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے سڑک پر قدم رکھا اور کسی نیند میں چلانے والے شخص کی طرح گھر کی طرف مڑ گیا۔ ایک گاڑی کو راستہ دینے کے لیے میں خود بخود سڑک سے ہٹ گیا۔ گاڑی کے شائیں سے گزر جانے کے بعد میں وہاں کھڑا کسی ایسے شخص کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جسے گہری نیند سے اٹھا دیا گیا ہو۔ میں نے دیکھا کہ اندھیرا چھا رہا ہے۔ میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ ٹڈے، جھینگر اور دوسرے کیڑے مکوڑے اپنی رات کی چیخ و پکار شروع کر چکے تھے۔ میرے مدہوش دماغ کو یہ آوازیں خشک مسام دار زمین سے رستی ہوئی آہ و زاری کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔

راستے میں میری ملاقات بوڑھے کولا سوریا سے ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح اس کے الجھے ہوئے بال اس کے بوڑھے چہرے کے گرد پھیلے ہوئے تھے۔ جب میں نے اسے ایک

پاؤں پیچھے گھسیٹ کر لنگڑاتے ہوئے دیکھا تو مجھے ابا یاد آ گئے۔ ابا نے اس بیماری کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے جبکہ کولا سوریا ابھی تک اس سے جنگ لڑ رہا تھا۔

جب بیماری نے اسے اپنی سرکاری نوکری چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا تو وہ تقریباً پچاس برس کا تھا۔ اب وہ وقت کی قید سے آزاد نظر آتا تھا۔ وہ ماضی اور مستقبل دونوں کے بارے میں نہیں سوچتا تھا۔ وہ تمام وقت پوری طرح حال میں رہتا تھا۔

اس نے اپنے بیٹے کی شادی بہت عمدہ طریقے سے کی تھی۔ جب اس نے اپنی بیٹی کی شادی ایک بڑے لائق نوجوان کے ساتھ کی تھی تو اسے ایک لاکھ روپے کا جہیز دیا تھا۔ اب اس کا جسم بیماری سے تباہ ہو چکا تھا لیکن اس نے ہار ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اگرچہ اس کے بیٹے اور بیٹی نے اب اسے بالکل اکیلا چھوڑ دیا تھا پھر بھی وہ اس قابل تھا کہ ماضی کو بغیر پچھتاوے اور مستقبل کو بغیر خوف کے دیکھ سکے۔ وہ بظاہر اپنے بچوں کے متعلق شاذ و نادر ہی سوچتا تھا۔ درحقیقت یہ کہنا پوری طرح درست نہیں کہ اس کے بچوں نے اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ اصل میں خود کو ان سے الگ کر لیا تھا۔ جب کوئی اس سے پوچھتا کہ کیا اب اسے اپنے بچوں کی پرواہ نہیں ہے تو اس کے پاس ایک گھڑا گھڑایا جواب تیار رہتا: ''میں نے ان کا حق انہیں دے دیا ہے۔'' وہ ان کے متعلق کسی رنج، خوشی اور غصے کے بغیر سوچ سکتا تھا۔

''پوسٹ ماسٹر، کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ، کہیں بھی نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اروندا، کیا تمہیں یاد ہے کہ میں تمہیں ہمیشہ کیا بتاتا ہوں؟ جو ہو گیا اس کے متعلق کبھی نہ سوچو اور نہ ہی مستقبل کے بارے میں پریشان ہو۔ ان دونوں کے بارے میں پریشان ہونے سے ہی دنیا کے تمام الجھاؤ پیدا ہوتے ہیں۔''

''اگر کوئی ماضی اور مستقبل نہیں ہے تو پھر حال کس طرح ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ دوبارہ مسکرایا۔

مجھے یہ حال ستانے لگا کہ میں اماں کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ اماں سے ملنے نہ

جانے پر میں قصور وار محسوس کر رہا تھا۔ مینکا اب شاید ہی کبھی اماں سے ملنے جاتی کیونکہ وہ ابھی تک اسے دیکھ کر غصے میں آجاتی تھیں۔ پھر بھی مینکا انہیں بکثرت اور رنجیدگی سے یاد کرتی رہتی۔

''یہ ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچنا ہی ہے جو ہماری زندگیوں کو الجھا دیتا ہے۔'' مجھے چیزوں کی طرف دیکھنے کا یہ انداز پسند آیا۔ جونہی میرا دماغ ماضی میں جاتا مجھے اماں یا کسی اور کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں یاد آجاتیں اور پچھتاوا مجھے ڈسنے لگتا۔ جب مجھے مستقبل کے بارے میں سوچنا پڑتا تو میرے دماغ پر خوف طاری ہو جاتا۔ کوئی بہت جری دل ہی بغیر جھرجھری لیے ماضی اور مستقبل دونوں کا مقابلہ کر سکتا ہے: ایک جری دل اور ایک متوازن ذہن۔

دسواں باب

ایک ہفتے بعد مجھے سارا کا خط ملا۔ اسے پڑھتے ہوئے مسرت، پچھتاوے، خوف اور شرمندگی نے میرے ذہن کو گھیر لیا۔ اس نے سیدھے سادے الفاظ میں وہ سب کچھ لکھ دیا تھا جو وہ مجھ سے براہ راست نہیں کہہ پائی تھی۔ آخر کار اب میں سارا کے اس دن کے اشارے اور سوال سمجھا۔ اس دن تو ہم نے مستقبل کے بارے میں بالواسطہ طریقے سے بات کی تھی۔

اب میں خوش تھا کہ اس نے وہ باتیں نہیں کی تھیں جو اس کے ذہن میں تھیں۔ اس نے پوچھا تھا کہ میری تنخواہ کتنی ہے۔ میں اتنا احمق تھا کہ جب اس نے گھر کے کرائے اور رہنے کے خرچے کی بات کی تو پھر بھی میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

''آؤ اپنے والدین کو بتائے بغیر ملک کے کسی دوسرے حصے میں چلے جائیں۔'' اس نے لکھا۔ ''ہم ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے سکتے ہیں اور تم ریل سے کام پر جا سکتے ہو۔ بعد میں اگر ہمارے والدین نے ہمیں ڈھونڈ بھی لیا تو ہم قانون کے مطابق شادی کر سکتے ہیں۔

''میں اپنے والدین کو اپنی زندگی کا فیصلہ نہیں کرنے دوں گی۔ میں ان کی عزت کرتی ہوں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں لیکن وہ مجھے تم سے شادی نہیں کرنے دیں گے۔ وہ مجھے مجبور کریں گے کہ میں ان کی پسند کے آدمی کے ساتھ شادی کروں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا حق ہے چاہے اس سے

انہیں تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے۔''

اس نے مجھ پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ میری تنخواہ میں گھر چلا سکتی ہے مجھے ہر قسم کی تفصیلات لکھ دیں۔ لیکن جس چیز نے مجھے حیران کیا وہ اس کی اپنے والدین کے متعلق رائے تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں سارا محض ان خیالات کو تو نہیں دہرا رہی جو اس نے اپنے سے بڑی کسی عورت سے حاصل کیے تھے۔

''میں یہ نہیں کہتی کہ اماں کا اعلیٰ حیثیت کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ کی خواہش رکھنا غلط ہے۔ میں ان کو ایسے لوگوں کے ساتھ رشتے داری قائم کرنے کی کوشش کرنے پر بھی الزام نہیں دیتی۔ سو میں نے نوے لوگ اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے کہ......

''ابا کی واحد خوشی پیسہ کمانا ہے۔ مجھے اس میں کوئی کشش نظر نہیں آتی، لیکن میں ان کو بھی اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر الزام نہیں دیتی......

''میں نہیں جانتی کہ آیا ابا سے شادی کے وقت اماں کے جذبات کا ذرا بھی خیال رکھا گیا تھا یا نہیں۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ واقعی کسی تاجر سے شادی کرنا چاہتی ہوں گی۔ بہر حال انہوں نے ان سے شادی کر لی اور وہ ایک محبت کرنے والی اور مخلص بیوی ثابت ہوئی ہیں۔ لیکن ان کی خواہش کہ اعلیٰ حیثیت کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ رکھیں ایک اشارہ ہو سکتی ہے۔ غالباً انہوں نے ہمیشہ ایسا ہی چاہا تھا۔ جب ان کی شادی ابا سے کی گئی تو انہیں شاید ان خیالات کو دبانا پڑا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ تم اب سوچو گے کہ اس طرح غور و فکر کرنے کے لیے میں بہت چھوٹی ہوں اور کسی اور کے خیالات دہرا رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ جب تمہارے والد کا انتقال ہوا تو تمہاری والدہ اور بہن سو رہی تھیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کے فوراً بعد ہی تمہاری والدہ اور مینکا میں جھگڑا ہو گیا۔''

اس نے لکھا تھا کہ وہ دولت کی پرواہ نہیں کرتی اور اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی کہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرے، اس کے بچے پالے اور ان کی ایسی پرورش کرے کہ وہ بڑے ہو کر اچھے انسان بنیں۔

''مینکا کے ساتھ جان پہچان کے بعد مجھے پتا چلا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں اس کی طرح جائیداد پر قبضہ کرنے پر یقین نہیں رکھتی۔ اگر تم ڈاکٹر بن گئے ہوتے تو میرے والدین

نے تمہیں بخوشی اپنے داماد کے طور پر قبول کر لیا ہوتا۔ میں کتنی خوش ہوں کہ میں تمہیں صرف تمہاری وجہ سے چاہتی ہوں حتیٰ کہ ان کی خواہشات کے خلاف بھی۔ شادی میری ہونی ہے لہٰذا بھلے برے کا سامنا مجھے کرنا پڑے گا نہ کہ اماں یا ابا کو۔ انہیں اس بات کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ مجھے کسی ایسے شخص کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کریں جس کا میں خیال نہ رکھ سکوں۔ شاید وہ خوفزدہ ہیں کہ شادی کے بارے میں میرے خیالات بہت بچگانہ ہیں اور اگر مجھے اپنی مرضی کرنے دی گئی تو مجھے دکھوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ زیادہ تر والدین ایسے ہی سوچتے ہیں۔ اس سے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ لوگ کتنے خودغرض ہوتے ہیں۔ وہ خود کو ہر حال میں خوش رکھنا چاہتے ہیں۔

''جب میں ویسا کرنے سے انکار کروں گی جیسا وہ چاہتے ہیں تو انہیں بہت تکلیف ہوگی، لیکن میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ انہیں میری شادی شدہ زندگی میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے۔ میں انہیں دخل اندازی کرنے اور ہر چیز کو بگاڑنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ اگر ہم کسی غریب خاندان کے بارے میں بات کر رہے ہوں تو شاید ہم والدین کو اس بات کا الزام نہیں دیں گے کہ وہ اپنی بیٹی کو کسی امیر نوجوان سے شادی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ لیکن میرے والدین کے پاس تو یہ بہانہ بھی نہیں ہے۔''

میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ اپنی تمام تر کوشش کے بعد ہی میں سارا کی تجویز کے متعلق سوچنے کے قابل ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے پہلے بھی کئی مرتبہ مجھے اکٹھے زندگی گزارنے کے متعلق سوچنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی تھی اگرچہ اشاروں کنایوں میں۔ اس نے یقیناً بہت عرصہ پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے ہی شادی کرے گی چاہیے اسے ایسا اپنے والدین کی نافرمانی کر کے ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

اگر ہم بھاگ گئے تو اس کے والدین کو ہمیں تلاش کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔ وہ ہمارے پیچھے پولیس لگا دیں گے۔ ہمیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور ہم کبھی یہ بدنامی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ لوگ بغیر شادی کے ہمارے میاں بیوی کی طرح رہنے پر ہم سے نفرت کریں گے۔ وہ گلیوں میں ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہونے کے بعد دوبارہ دفتر کیسے جاؤں گا؟ اور اگر مجھے سزا ہو گئی!

اگر صرف مجھ کو سزا ہوئی تو سارا غالباً خود اپنی جان لے لے گی۔

سارا بغیر شادی کیے میرے ساتھ رہنے پر تیار تھی۔ آخر کار شادی محض ایک رسم ہی تو ہے۔ میں اس تجویز سے اتنا خوفزدہ کیوں تھا کہ ایک نوجوان مرد اور عورت، جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، مروجہ رسم و رواج کی پابندی کیے بغیر اکٹھے زندگی بسر کر لیں؟ درحقیقت میں اس کو ذرا بھی غلط نہیں سمجھتا تھا۔ میں صرف اس لیے خوفزدہ تھا کہ لوگ ہمارا تمسخر اڑائیں گے۔ لیکن سارا اس بارے میں ذرا بھی فکر مند نہیں ہوئی تھی۔

میں سوچوں کے صحرا میں گم تھا۔ میں نے اپنے اندر سارا کے لیے بہت احترام محسوس کیا۔ میرے لیے اس کی محبت نے اسے اتنی طاقت دی تھی کہ وہ ایسا فیصلہ کر سکنے کے قابل ہو گئی تھی۔ اور اس کے باوجود بھی میں اس بات سے اتنا خوفزدہ تھا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ میں طے شدہ راستے سے فرار ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میں یہ سوچنا پسند کرتا تھا کہ مجھے عوامی رائے اور روایت پسندی سے نفرت ہے لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس کے مطابق عمل بھی کر سکتا۔

میں نے خط دوبارہ پڑھا۔ میں اس احساس سے چھٹکارا نہ پا سکا کہ سارا کو انکار کرنا بزدلانہ حرکت ہو گی۔ جب میں نے پہلی مرتبہ خط پڑھا تھا تو میرا واحد ردعمل میری پریشانی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں سارا سے محبت کرتا ہوں لیکن یہ محبت میرے رسمی خیالات پر غالب نہ آ سکی۔ سارا اس قسم کی جذباتی باتیں نہیں لکھتی تھی جیسے "میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" یا "میں اگلے جنم میں بھی تمہاری رہوں گی۔"

جب میں صرف دس برس کا تھا تب بھی میں گھر سے باہر اپنے رویے کے بارے میں بہت محتاط رہتا تھا اگرچہ گھر میں بعض اوقات میں خاصا جنگلی پن کا مظاہرہ کرتا تھا۔ جب میں سولہ برس کا ہوا تو میرے اندر تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ میں گھر پر بھی بہت تابعدار ہو گیا لیکن میں کبھی اپنے اس خوف پر قابو نہ پا سکا کہ لوگ کیا کہیں گے۔

میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ سارا کی تجویز کے بارے میں کیا کروں۔ اب میری زندگی ایک بدحواسی کے عالم میں گزرنے لگی۔ مینکا رات کے کھانے پر حسب معمول باتیں کر رہی تھی۔ "کیا ہوا ہے؟" جب میں نے اس کی باتوں کا جواب نہ دیا تو اس نے پوچھا:

''کیا تمہاری زبان گم ہوگئی ہے؟''

مینکا صرف اپنی انگلیوں کی پوریں استعمال کرتے ہوئے بہت جلد کھانا ختم کر لیتی۔ وہ شوربہ پسند نہیں کرتی اور نہ ہی بیشتر لوگوں کی طرح کھانے کو پلیٹ میں نرم کرتی ہے۔ دھرم داس اپنے کھانے کو مزے لے لے کر مسلتا ہے اور بہت خوش خوراک ہے۔ میں نے چند لقمے لیے، پانی پیا اور بے چینی سے ان کے اپنی کرسیوں سے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔

میں جلد سونے چلا گیا لیکن اس رات گہری تاریکی میرے ذہن اور جسم کو سکون دینے میں ناکام رہی۔ اکثر ایسی تاریک راتوں میں جلد ہی میرا دماغ سوچوں اور جسم وزن سے آزاد ہو جاتا تھا لیکن اس رات کو میں بالکل بے حس و حرکت لیٹا تھا لیکن میرا ذہن بہت مضطرب تھا۔ ان گنت خیالات میرے ذہن میں پھوٹ رہے تھے جیسے بارش کے دنوں میں چھوٹے پروں والے کیڑے اپنے زیرزمین بلوں سے نکل آتے ہیں۔

میرا حال ایسا ہی تھا جیسے میں پاؤں چکی پر کھڑا ہوں۔ بیزار کن سوچوں کے نہ ختم ہونے والے تسلسل سے تھک کر میرا ذہن اس تاریکی میں گھل گیا جو پہلے ہی بیرونی دنیا کو نیست نابود کر دچکی تھی۔ مکمل تھکن کے عالم میں میں نیند اور جاگنے کے درمیان تیر رہا تھا۔ دو مرتبہ میری ایک ٹانگ غیرارادی طور پر مڑگئی اور مجھے پھر اسی تکلیف دہ شعوری صورت حال میں واپس لے آئی۔

کوؤں کی اولین کائیں کائیں کے ساتھ میرا ذہن دوبارہ اس طرح حرکت میں آ گیا جیسے وہ کبھی رکا ہی نہ تھا۔ کیا مجھے مینکا سے مشورہ کرنا چاہیے؟ میں ان خطوط پر سوچنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ سارا نے لکھا تھا، ''مینکا کے ساتھ جان پہچان کے بعد مجھے پتا چلا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

میں نے باغ میں ایک چکر لگانے کا فیصلہ کیا۔ مینکا پہلے ہی مصروف تھی۔ ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے مجھے اس کی آواز ایسے معلوم ہوئی جیسے باورچی خانے میں گھنٹی بج رہی ہو۔ وہ باورچی کو ڈانٹ رہی تھی: ''تمہیں بہت پہلے اٹھنا چاہیے! ناشتہ کبھی وقت پر تیار نہیں ہوگا۔'' مجھے پچھلے صحن میں جامس کے جھاڑو دینے کی آواز آ رہی تھی۔

باغ میں لگا ہوا جامن کا درخت لدا ہوا تھا۔ اس کے پھل صبح کے وقت دھوپ میں چمکتے ہوئے سرخ رنگ کے نظر آرہے تھے۔ گھاس پر بکھری ہوئی جامنوں سے پتا چلتا تھا کہ رات کے وقت درخت پر چمگادڑوں کا بسیرا تھا۔ باغ کے سرے پر موجود گھرے سایوں کو دیکھ کر مجھے ابا یاد آگئے۔ وہ ہر صبح یہاں چہل قدمی کرتے تھے۔ ان کی چہل قدمی سے باغ میں جو راستہ ابھی تک اتنا غائب نہیں ہوا تھا جتنی میرے ذہن سے ان کی شبیہہ۔ میں اب اپنے ذہن میں ان کی اس وقت کی کوئی تصویر نہ کھینچ سکتا جب وہ زندہ تھے۔ میرے ذہن میں ان کی صرف وہی تصویر بنتی جیسے وہ ڈرائنگ روم میں لٹکی ہوئی اپنی شادی کی تصویر میں دکھائی دیتے تھے۔

سڑک کے اس پار دھان کے چھوٹے چھوٹے پودے ہوا میں کسی جھیل کی طرح ہلکورے لے رہے تھے۔ دھرم داس، جو ناشتہ کر چکا تھا اور بنا ٹھنا ہوا تھا، بیل گاڑی میں سوار ہوکر اسٹیشن روانہ ہوگیا۔

''میں تم سے سارا کے متعلق تقریباً دو مہینے پہلے بات کرنا چاہتی تھی۔'' مینکا نے سارا کے خط پڑھنے کے بعد کہا۔''میں نے اس کے والد سے تمہارے متعلق بات کی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے ابا کی وفات سے پہلے بات کی تھی۔ اس وقت انہیں تم پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن ابا کی وفات کے بعد صورت حال تبدیل ہوگئی۔ جب میں دوبارہ ان کے پاس گئی تو انہوں نے میری بات سننے سے انکار کر دیا۔ یہ تقریباً ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔''

''کیا سارا جانتی ہے کہ تم اس کے والد کے پاس جا چکی ہو؟''

وہ مسکرائی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اب مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔''

''وہ جانتی ہے۔''

اب میری سمجھ میں آیا کہ سارا اپنے والدین کے ساتھ میرے بات کرنے کی تجویز پر اتنی پریشانی کا مظاہرہ کیوں کرتی تھی اور اسے اتنا یقین کیوں تھا کہ مینکا بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی۔ لیکن مینکا نے مجھے سارا کے والد سے اپنی ملاقاتوں کے بارے میں کیوں

نہیں بتایا تھا؟

''کیونکہ تم پہلے سے جانتے تھے کہ وہ تمہیں قبول نہیں کریں گے۔''

''یہ واضح ہے کہ اس نے تمہیں ایسا خط صرف اس لیے لکھا ہے کیونکہ اسے اپنے والدین کے قائل ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔'' مینکا نے خط کے کچھ جملے دوبارہ پڑھے۔ ''ہاں شاید اسے تمہاری وجہ سے اپنے والدین کے گھر میں بوڑھا ہونا پڑے۔''

''منصوبے بنانا تو بہت آسان ہوتا ہے لیکن ان پر عمل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔''

''لیکن سارا میں اتنی اہلیت ہے کہ وہ اس پر عمل بھی کر گزرے۔ گو وہ خاموش طبع ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ اسے کیا کرنا ہے!''

یہ بات سن کر مجھے جھرجھری آ گئی۔ ''تم سارا کے خط پر ہنس رہی ہو یا مجھ پر؟''

''دونوں پر نہیں۔'' اس قدر ترشی سے کہا۔ ''کیا تم نہیں سمجھ سکتے کہ اس نے تمہیں یہ خط لکھنے پر اپنے آپ کو آمادہ کرنے سے پہلے یقیناً کئی مہینے سوچا ہوگا؟''

مجھے پھر سے سارا کے خط کا وہ فقرہ یاد آ گیا، ''مینکا کے ساتھ جان پہچان کے بعد ہی مجھے پتا چلا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' اس سے پہلے کہ مجھے سوچنے کا وقت ملتا الفاظ میرے منہ سے نکل چکے تھے، ''اس نے تمہیں یقیناً بتا دیا ہوگا کہ وہ مجھے خط لکھے گی۔''

''تم ہوش میں تو ہو؟''

''ناراض مت ہو۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ میرے منہ سے نکل گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سارا کو کیا لکھوں۔''

مینکا کا مشورہ غیر متوقع تھا حالانکہ میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ وہ صرف فائدے کا سوچتی ہے۔

اس نے کہا: ''سارا اب کالج جانے والی احمق لڑکی نہیں ہے جس کا دماغ رومانوی خیالات سے بھرا ہو۔ اب وہ ایک دانش مند بالغ عورت ہے۔ تمہیں اس جیسی بیوی کی ضرورت ہے ورنہ تم بھی ابا جیسے ہو جاؤ گے۔ طبیب بننے کے بعد ہی ابا کے حالات بہتر ہونا شروع ہوئے تھے۔ لیکن ایسا کئی برس ایک کام کے بعد دوسرا کام کرنے کے بعد ہی ہوا تھا۔

انہیں ایک متوازن زندگی کی قدر و قیمت مشکل طریقے سے سیکھنا پڑی تھی۔

''سارا کے والد نے اب تک دس لاکھ روپے سے زیادہ ضرور جوڑ لیے ہوں گے۔ اس رقم پر سارا کا حق ہے۔ سارا ایک ذہین لڑکی ہے۔ جب اس نے تمہیں خط لکھا تو وہ یقیناً جانتی ہو گی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔''

اس نے مجھے بتایا کہ گو میں خاصا ہوشیار ہوں لیکن مجھے دنیا میں آگے بڑھنے کے طریقے نہیں آتے۔ سارا اپنے والدین کی مرضی کے خلاف میرے ساتھ شادی کرنے پر تیار ہے۔ وہ یہ خطرہ مول لینے پر بھی رضامند ہے کہ اسے عاق کر دیا جائے۔ آخر کیوں؟

میں نے مینکا کو سارا کا خط اس لیے دکھایا تھا کہ مجھے اپنی پریشانی کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ مینکا اس صورت حال کو صرف ایک زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ اسے میرے یا سارا کے جذبات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ صرف مصلحت آمیز لائحہ عمل پر یقین رکھتی تھی۔

''فرض کرو سارا کے والد نے ہمیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کروا دیا؟''

''اگر تمہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہونا پڑا تو ہو جانا۔ اتنی سی تو بات ہے۔''

''لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ وہ ہم سے نفرت کریں گے۔''

''تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟ جن تھوڑے بہت لوگوں کو اس بات کا پتا چلے گا وہ بھی ایک دو مہینے بعد بھول جائیں گے۔ اور اخباروں کے متعلق کیا خیال ہے؟ تم نے ان کے متعلق نہیں سوچا! اگر یہ خبر اخباروں میں چھپ گئی تو بہت سے لوگ جو تمہیں بالکل نہیں جانتے وہ بھی اس کے متعلق سب کچھ جان جائیں گے۔ میں تمہیں صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس سے ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔ اگلی صبح کا اخبار آنے تک وہ اس کے متعلق سب کچھ بھول چکے ہوں گے۔ زیادہ تر لوگ ایسی خبریں اتنی سنجیدگی سے نہیں لیتے جتنا تم لیتے ہو۔ دوسرے لوگوں کے متعلق کیوں سوچا جائے۔ میرا نہیں خیال کہ سارا کے والد بھی زیادہ عرصے تک ناراض رہیں گے۔''

چیزوں کی طرف دیکھنے کا یہ انداز خاصا پرکشش تھا۔ مینکا فیصلے کرنے میں دیر نہیں لگاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ موقع ملتے ہی اس سے فائدہ کس طرح اٹھانا ہے اور پھر جو کچھ کیا ہے اسے درست کس طرح ثابت کرنا ہے۔ جو صورت حال عمل کی متقاضی ہوتی مجھے اس

سے زیادہ خوف کسی چیز سے نہیں آتا تھا اور کسی مسئلے سے بچنے کے لیے میں ہمیشہ بہانے کی تلاش میں رہتا تھا۔ بعد ازاں میں تلخی سے اپنی غفلت کے گناہوں پر نادم ہوتا تھا۔ مینکا کبھی اپنی حرکتوں پر پچھتاتی نہیں تھی اور بظاہر صورت حال کو جانچنے میں ذرا بھی وقت نہیں ضائع کرتی تھی۔ اس کی بجائے وہ ایسے لائحہ عمل کو ترجیح دیتی تھی جو اس کے لیے بہترین ہوتا تھا۔

جائیداد کے مسئلے پر اماں کے ساتھ اس کی لڑائی کا خاتمہ اس پر ہوا کہ اماں نے اپنے آپ کو ہم سے علیحدہ کر لیا۔ پھر بھی مینکا یہ محسوس نہیں کرتی تھی کہ اس کے پاس نادم ہونے کی کوئی وجہ ہے۔ وہ اس رنجش پر صرف غمزدہ تھی اور اکثر اماں کے متعلق باتیں کرتی تھی۔ میں جب بھی اماں کو کوئی تحفہ بھیجتا تو وہ بھی ایسا ضرور کرتی۔

یقیناً مینکا اپنے احساسات کے مطابق عمل کرنے میں بیشتر دوسری عورتوں جیسی ہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کے احساسات دوسری عورتوں سے مختلف تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ زندگی کو بھی صرف ایک خاص قسم کا نفع و نقصان کا لین دین سمجھتی ہے۔

مینکا کی حوصلہ افزائی نے صورت حال کو تبدیل کر دیا اور اب میں بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے سارا کے منصوبے کو رد نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن میں اب بھی بھاگ کر کسی دوسرے شہر جانے کے خیال کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔

''اس کی بجائے سارا کو یہاں لانے میں کیا خطرہ ہے؟'' میں نے مینکا سے پوچھا۔

''ذرا بھی خطرہ نہیں ہے۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''درحقیقت میں ایسا ہی چاہتی ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ دھرم داس کو یہ بات پسند آئے گی یا نہیں۔ مجھے ویسا ہی کرنا پڑے گا جیسا وہ کہے گا۔''

جب دھرم داس نے سارا کے خط اور مینکا کے مشورے کے متعلق سنا تو وہ غصے میں آ گیا۔

''کیا تم نے واقعی اس سے یہ کہا ہے کہ کسی لڑکی کو یوں بھگا کر لے جائے؟''

''سارا خود گھر سے بھاگنا چاہتی ہے۔'' مینکا نے کہا۔

''اس کی عمر کیا ہے؟''

''تقریباً انیس برس۔''

دھرم داس طنزیہ انداز میں ہنسا۔''پھر وہ نابالغ ہے۔ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو قانون کی نظر میں یہ اغوا ہوگا۔''

مینکا کا چہرہ لٹک گیا۔ اس نے اس کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ دھرم داس نے ہمیں خلوص نیت سے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

''کیا تم نے کبھی کسی اچھے خاندان کے لڑکے کو ایسی حرکت کرتے سنا ہے؟''

''اور کیا تم نے سارا کا خط پڑھا ہے؟'' مینکا نے طنزیہ انداز میں اس سے پوچھا۔ ''کیا وہ اچھے خاندان کی لڑکی نہیں ہے؟''

''ہمیں سارا کے خاندان کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی عزت یا بے عزتی ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔'' دھرم داس نے ناراضگی سے جواب دیا۔''اس طرح کی رسوائی نسلوں تک یاد رکھی جاتی ہے۔''

اب مجھے اس جواب کے متعلق سوچنے کی مزید ضرورت نہیں تھی جو مجھے سارا کو بھیجنا چاہیے تھا۔ دھرم داس کی سرزنش کسی ایسے شخص کی آنکھ میں انگلی چبھونے کے مترادف تھی جو پہلے ہی رونے کے قریب ہو۔

''تم اس کی بات کس طرح مان سکتے ہو۔ دھرم داس تو ڈر رہا ہے کہ تمہیں اغوا کے جرم میں عدالتوں میں گھسیٹا جا سکتا ہے۔'' مینکا نے میرے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں جانتا ہوں کہ اسے اب کیا جواب دینا ہے۔''

''ہمارے درمیان ہونے والی بحث کے متعلق ایک لفظ بھی اسے نہ لکھنا۔ صرف یہ لکھ دو کہ اس کے منصوبے پر فوراً عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔''

وہ کتنی دور اندیش تھی! اس میں اتنی عقل تھی کہ یہ سمجھ سکے کہ سارا کے بالغ ہونے کے بعد ہمارے لیے فرار ہونا اور شادی کرنا آسان ہوگا۔ بہر حال اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مینکا کیا چاہتی ہے۔

سارا ایسے جواب کے متعلق کیا سوچے گی؟ ''مینکا کے ساتھ جان پہچان کے بعد مجھے پتا چلا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' میں بھی مینکا کا اثر کیوں نہ قبول کرلوں؟

گیارھواں باب

میرا خط ملنے کے آٹھ مہینے بعد سروجنی کی شادی سری داس کے ساتھ ہوگئی۔ یہ خاصی بڑی شادی تھی جس میں بہت سی اہم شخصیات نے شرکت کی۔ سروجنی یہ سب ہنگامہ نہیں چاہتی تھی اور اس نے اس وجہ سے اپنی والدہ اور سری داس دونوں جھڑکا: ''آپ شان و شوکت کا مصنوعی مظاہرہ کیوں چاہتے ہیں؟'' اسے محسوس ہوا کہ یہ اس کی والدہ اور سری داس کی سازش تھی۔ اس کے والد نے ان کی مخالفت نہ کی اگرچہ انہیں بھی ان کے منصوبوں کی پرواہ نہیں تھی۔

مجھے دعوت نامہ بھیجا گیا تھا لیکن میں نے شادی میں شرکت نہ کی۔ شادی سے دو روز قبل میں نے ہر طریقے سے سری داس کی مدد کرنے کے لیے اس کے ہاں قیام کیا۔ شادی کے بعد سری داس اور سروجنی دو روز کے لیے سری داس کی زمینوں پر بنے بنگلے میں گزارنے کے لیے چلے گئے۔

ان کی واپسی پر سری داس کے گھر ان کو خوش آمدید کہنے والے مہمانوں میں بھی شامل تھا۔ میں اس سے بچ نہیں سکتا تھا۔ سری داس کی والدہ کو لوگوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام کروانے کا ڈھنگ آتا تھا۔

جب میں نے سروجنی کو گاڑی سے نکلتے اور سری داس کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے دیکھا (ان کے جسم آپس میں ٹکرا رہے تھے) تو میں ماضی کے متعلق سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے اس کو بھیجا ہوا اپنا احمقانہ خط یاد آیا اور مجھ پر شرمندگی غالب آ گئی۔

وہ مجھ سے اس طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو حالانکہ میرا خط پڑھنے کے بعد میرے ساتھ یہ اس کی پہلی بات چیت تھی۔ میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ میرا خط ملنے کے بعد وہ مجھ سے ملنے سے کتراتی تھی۔ اگر کہیں ہماری اتفاقیہ ملاقات ہو بھی جاتی تو وہ یوں ظاہر کرتی جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

مینکا نے مجھے کئی مرتبہ بتایا کہ میرے خط سے سروجنی کو بہت تکلیف پہنچی تھی اور اس نے بہت تذلیل محسوس کی تھی۔ مینکا نے غصے سے کہا کہ ایسا میرے انکار کے باعث نہیں ہوا تھا بلکہ سروجنی نے اس لیے اتنی ہتک محسوس کی تھی اور ناراض ہوئی تھی کیونکہ میں نے اسے نصیحت کرنے کی کوشش کی تھی۔

''اگر ہم تمہاری تجویز پر عمل کرتے ہوئے میاں بیوی کے طور پر رہنا شروع کردیں تو بدنامی تمہاری ہوگی میری نہیں۔ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ تمہیں خود کو اس طرح تباہ نہیں کرنے دوں گا۔'' میرے اس طرح کے پند و نصیحت نے اسے ناراض کر دیا تھا۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اروندا اتنا بزدل ہے۔'' اس نے کہا تھا۔ مینکا نے مجھے تمام تفصیلات بتائی تھیں۔ وہ مجھے یہ دکھانے کے لیے بیتاب تھی کہ اس کے اندازے کتنے درست تھے۔

''اور تم نے اس کا خط بارہا پڑھا!'' مینکا نے کہا۔''تم اسے بالکل نہیں سمجھ سکے۔ اگر تم نے صرف یہ کہا ہوتا کہ اس کے منصوبے پر فوری عمل درآمد ممکن نہیں ہے تو اسے نہ وہ اپنی توہین سمجھتی اور نہ ہی اسے غصہ آتا۔ جب اس نے تمہیں خط لکھا تھا تو اس نے یقیناً اس امکان کو مدنظر رکھا ہوگا کہ تم رضا مند ہو گے۔تم اسے تب تک انتظار کرنے کا کہہ سکتے تھے جب وہ اکیس برس کی نہیں ہو جاتی۔تمہارا کیا خیال ہے کہ اسے اس بات کا پتا نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ بھاگ کر وہ اپنی عزت کی قربانی دے رہی ہے؟ تم نے اسے نہایت ہی احمقانہ خط لکھا۔''

میں بہت نادم تھا۔ تاہم دو یا تین مہینے میں میں سب کچھ بھول گیا، حتیٰ کہ سارا کا تصور بھی میرے ذہن سے غائب ہو گیا۔ میری زندگی بتدریج تبدیل ہوئی، یہاں تک کہ

مجھے بھی اس تبدیلی کا علم نہ ہوا۔

مستقبل ایک تاریک اور خوفزدہ کر دینے والی کھائی جیسا تھا لہٰذا میں نے اس کے بارے میں سوچے بغیر زندہ رہنا سیکھ لیا۔ میں نے بوڑھے پوسٹ ماسٹر کے انداز فکر کو اپنانا شروع کر دیا۔ کولا سوریا کا ذہن بظاہر ماضی اور مستقبل کو الٹا پلٹا دیتا تھا۔ مینکا اسے جنونی یا صرف ایک احمق سمجھتی تھی۔

مہمانوں کے جانے کے بعد سروجنی نے نئی ساڑی اور بلاؤز پہن لیا۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں واپس آئی تو میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اس میں ایک پراسرار تبدیلی آچکی ہے۔ اس کا خوبصورت چہرہ اور متناسب جسم ویسا ہی تھا لیکن اب وہ ایک بھرپور عورت بن چکی تھی۔ شادی سے یہ اچانک تبدیلی کیسے آتی ہے؟

''اروندا، کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟'' اس کا لہجہ غمگین تھا لیکن اس کے چہرے پر غم کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

''نہیں۔''

''مجھے بعد میں احساس ہوا کہ ویسا خط لکھنا غلط تھا۔''

مجھے پتا چل گیا کہ وہ طنز کر رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اگر سروجنی چاہتی تو وہ بھی ہر طرح سے مینکا کی طرح ترش زبان استعمال کر سکتی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی ہر بات خاموشی سے سن لوں گا۔

''نہیں، وہ غلط نہیں تھا۔ غلطی میری تھی۔ بعد میں مجھے تمہیں ایسا احمقانہ جواب بھیجنے پر بہت افسوس ہوا۔''

''میں ان دنوں صرف تمہاری وجہ سے سری داس کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ اگر میں نے تمہارے لیے دو تین برس انتظار بھی کیا ہوتا تو پھر بھی مجھے اپنے ابا اور اماں کی نافرمانی کرنی پڑتی۔ ہم چاہے جب بھی شادی کرتے ہر صورت میں ہماری بدنامی تو ہونی ہی تھی۔''

وہ مجھ پر ارادتاً طنز کر رہی تھی لیکن وہ ایسی باتیں انتقاماً نہیں کر رہی تھی جیسا کہ مینکا کی عادت تھی۔

سروجنی نہیں جانتی تھی کہ اسے خط لکھنے کے بعد جلد ہی میری زندگی تبدیل ہونا

شروع ہوگئی تھی۔ جب میں ابھی سکول میں ہی تھا تو مجھے چیزوں سے لاتعلقی برتنے کی عادت تھی۔ جب ابا مجھے ڈاکٹر بنانے کے لیے بے چین تھے تو میں نے یونیورسٹی کے داخلہ کے لیے تیاری کرنے میں ذرا بھی دلچسپی محسوس نہیں کی تھی۔ سروجنی سے ملنے کے بعد میں ذرا کم بے پروا ہو گیا تھا حالانکہ وہ بھی مجھے پوری طرح بیدار کرنے میں ناکام رہی تھی۔

اماں کے جانے سے میرے اوپر جو افسردگی طاری ہوئی تھی وہ بمشکل ایک مہینہ چلی۔ مینکا اکثر افسردگی سے ابا کی باتیں کرتی تھی۔ اس دوران میرے جذبات بھی اس جیسے ہی ہوتے تھے لیکن میں نے خود شاید ہی کبھی ابا کے متعلق سوچا ہو۔ بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میری زندگی لاتعلقی کی دلدل میں دھنستی چلی جا رہی ہے۔ جب سروجنی نے میرا انتظار کرنے کی بجائے سری داس سے شادی کر لی تو میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا۔

''سری داس بہت اچھا انسان ہے۔ تم اس کے ساتھ اچھی زندگی گزارو گی۔'' میں نے کہا۔

''میں نے اسے بتایا کہ کبھی میں تم سے بھی محبت کرتی تھی۔ میں نے اسے صرف آخری خط کے متعلق نہیں بتایا۔''

''میں نے اس خط کے سوا تمہارے تمام خط جلا دیے ہیں...... میں ابھی تک اسے تلاش نہیں کر سکا۔ وہ ضرور میری دراز میں کہیں پڑا ہوگا۔ میں اسے ڈھونڈوں گا۔''

''جب سارا کے والدین نے تمہیں نامنظور کیا تو اس نے مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا!'' سری داس نے ہماری طرف آتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ''جب چھوٹے سے کام نہیں بنا تو سارا نے بڑے بھائی سے شادی کر لی!''

''ہاں، اروندا کو کسی سے محبت کرنا یا حسد کرنا آتا ہی نہیں۔'' مینکا نے کہا جو اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ ''اگر کوئی آدمی کبھی کسی سے حسد ہی نہ کرے تو وہ محبت کس طرح کر سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں؟'' سری داس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ ''میں کسی سے حسد نہیں کرتا لیکن میں سارا سے بہت محبت کرتا ہوں!''

''اس کا یقین مت کرو۔ یہ حسد بھی کر سکتا ہے۔'' سروجنی نے کہا۔ ''تم نے دیکھا

نہیں یہ اس وکیل کے ہمارے گھر آنے پر کتنا ناراض ہوتا تھا!''

''اس کا حسد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''ہاں تم اس لیے ناراض ہوتے تھے کیونکہ تمہیں حسد محسوس ہوتا تھا اور تمہیں حسد اس لیے محسوس ہوتا تھا کیونکہ تم خودغرض تھے!''

''ہر محبت ایک قسم کی خودغرضی ہی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

مینکا اور سری داس ہنس دیے جبکہ سروجنی نیچے زمین کو تکنے لگی۔

''نہیں۔'' سری داس نے کہا۔ ''اب سارا اس وکیل سے بات کرے تو میں ناراض نہیں ہوں گا۔''

''ہاں۔اب!''

''میں اور تم اس پر بعد میں بحث کرلیں گے۔ میں تو تمہیں باہر برآمدے میں بلانے آیا تھا۔'' اس نے سروجنی سے کہا۔

''کس لیے؟''

''زمینوں کے مینجر، کلرک اور مزدوروں نے آتشبازی کا اہتمام کیا ہے۔ وہ ایک شاندار مظاہرے کے لیے پیسے جمع کرتے رہے ہیں۔''

''میں باہر نہیں آؤں گی۔'' سروجنی نے بے صبری سے کہا۔ ''میں ڈرائنگ روم سے دیکھوں گی۔ میں وہاں پر ایسے نہیں بیٹھنا چاہتی جیسے کسی مریض پر جادوٹونا کیا جا رہا ہو۔''

''میں تمہارے پاس بیٹھوں گا۔''

''اس طرح ہم احمق لگیں گے۔'' وہ ہنسی ۔''ایک کی بجائے دو مریض ہو جائیں گے۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ غالباً اس نے سوچا کہ میں دل ہی دل میں سری داس پر ہنسوں گا۔

''نہیں! صرف دلہن اور دلہا۔''

سری داس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سارا، جاؤ۔'' اس کی والدہ نے اسے حکم دیا۔

''اگر تم سمجھتی ہو کہ ہم اکٹھے بیٹھ کر احمق لگیں گے تو مجھے علیحدہ بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' سری داس نے کہا۔

''میں تمہاری اور اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھوں گی۔'' سروجنی ان دونوں بوڑھی خواتین کی طرف مڑ گئی۔ ''اگر ہم برآمدے کے عین درمیان میں بیٹھ گئے تو ہر ایک صرف ہمیں ہی گھورے گا۔''

''اگر لوگ ہمیں گھوریں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں تمہیں ہر ایک کو دکھانا چاہتا ہوں!''

اس نے فاتحانہ انداز میں کھیسیں نکالیں۔ سروجنی نے بات یہیں پر ختم کر دی۔ بظاہر اسے سری داس کی ہنسی زیادہ پسند نہ آئی۔

صحن، باغ حتیٰ کہ سڑک بھی آتشبازی دیکھنے کے لیے آنے والے دیہاتی مردوں اور عورتوں سے بھری ہوئی تھی۔ جب سارا نے اتنے بڑے ہجوم کو دیکھا تو وہ برآمدے کے ایک کونے میں سمٹ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی والدہ اور ساس کو اپنے پیچھے بلا لیا۔ باغ میں لٹکے ہوئے دونوں لیمپوں کو بجھا دیا گیا تھا۔ زیادہ تر ہجوم پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی پر جوش آوازیں رات میں پھیل گئی تھیں۔

آتشبازی لگاتار چل رہی تھی اور ہجوم میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ سری داس واضح طور پر خوش تھا کیونکہ وہ فخریہ انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

''سری داس آج بہت خوش ہے۔'' سارا کی والدہ نے کہا۔

فضا آتشبازی کے شور سے بھری ہوئی تھی جیسے دور آسمان میں بادل گرج رہے ہوں۔ ایک بار جیسے ہی تاریکی میں بہت سے انگارے چمکے اور روشنی دیوار کے باہر موجود ہجوم میں ایک چہرے پر پڑی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ میں پوسٹ ماسٹر کولاسوریا کو آتشبازی کے مظاہرے میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے سوچا کہیں مجھے غلطی تو نہیں لگی۔ لیکن نہیں۔ جب بھی آتشبازی روشن ہوتی میں اس چہرے کو تلاش کرتا اور وہ یقیناً کولاسوریا ہی تھا۔

میں ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا دروازے سے باہر آ گیا۔

''تم آتشبازی دیکھنے آئے ہو؟''

''نہیں۔ میں سری داس کی شادی سے پہلے اس سے ملنے نہیں آسکا تھا۔ اب میں یہ سب کچھ ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہوں تاکہ اندر جا کر اس سے مل سکوں۔ میں اس ہجوم میں سے راستہ نہیں بنا سکتا۔''

''آؤ۔ سری داس اور دلہن دونوں برآمدے میں بیٹھے ہیں۔''

ایک پٹاخے نے پھٹ کر سارے باغ میں مٹی اور ناریل کے خول کے ٹکڑے پھیلا دیے۔ ہجوم تتر بتر ہو گیا اور ہم برآمدے کی طرف راستہ بنانے کے قابل ہو گئے۔

''سری داس غالباً میرا مذاق اڑائے گا اور مجھ سے ہر قسم کے سوال کرے گا۔'' کولاسوریا نے کہا۔

''نہیں، آج اس کی شادی کا دن ہے۔ اسے مہمان نواز ہونا پڑے گا۔''

''کیا مینکا بھی موجود ہے؟''

''ہاں۔''

''مجھے امید ہے کہ وہ مجھے زچ نہیں کرے گی۔ وہ مجھے غصہ دلانے کی کوشش کیے بغیر بات نہیں کر سکتی۔''

''لیکن پوسٹ ماسٹر، تمہیں تو کبھی غصہ نہیں آتا؟''

''ہاں، مجھے غصہ نہیں آتا۔ لیکن اگر اس نے حسب معمول ان سب لوگوں کے سامنے مجھ پر چڑھائی کی تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''میں اسے روک دوں گا۔''

ہمارے گرد موجود دیہاتیوں کے تھکے ماندے چہرے خوشی سے ایسے ہی جگمگا رہے تھے جیسے آتشبازی سے۔ ان کی تفریح زیادہ تر مندر جانے یا جادو ٹونے کی رسم دیکھنے سے زیادہ شاندار نہیں ہوتی تھی۔ آتشبازی کا مظاہرہ تھوڑی دیر کے لیے انہیں ایک خیالی دنیا میں لے گیا تھا۔

''ہماری پوری زندگیاں آتشبازی کے مظاہرے جیسی ہیں۔'' کولاسوریا نے برآمدے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہم اپنا زیادہ تر وقت دن کی روشنی میں گزارتے

ہیں اس لیے ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ زندگی ایسی ہے۔ اگر آتشبازی کا یہ مظاہرہ دن کی روشنی میں کیا جاتا تو کیا کوئی اسے دیکھ کر لطف اندوز ہوتا؟''

کولا سوریا کی اس تقریر نے میرے اس احساس کو، جو مجھے بہت پہلے سے تھا، پختہ کر دیا کہ اس میں روحانی اسرار جاننے کی صلاحیت ہے حالانکہ وہ مخفی علوم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اسے وقت کا احساس صرف دن اور رات کی تبدیلی کی وجہ سے ہوتا تھا، ماضی اور مستقبل کے شعور کی وجہ سے نہیں۔

''پوسٹ ماسٹر، جب تمہاری شادی ہوئی اس وقت تمہاری عمر کیا تھی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے برآمدے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی کرسی پر سے جو اسے نے اپنے لئے منتخب کی تھی، لاپرواہی سے میری طرف دیکھا۔

''شادی کے وقت میری عمر اٹھائیس برس تھی۔''

''کیا کسی رشتے کروانے والے نے لڑکی تلاش کی تھی؟''

اس نے مسلسل میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے متعلق کچھ دیر سوچا۔

''ہاں ایسے ہی ہوا تھا۔''

''کیا اس وقت تم کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے؟''

''آہا! میں جانتا ہوں کہ تم کیا معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔تم میرے ماضی کو کھنگالنے کی کوشش کر رہے ہو!''

صحن میں کچھ ہلچل ہوئی۔ ایک آدمی، جس نے پائجامہ اور بوری کا برساتی کوٹ سر پر اوڑھ رکھا تھا، ایک بہت بڑے پہیے کی طرح گھومنے والی آتشبازی کے ساتھ کود رہا تھا جو کھمبے کے سرے کے ساتھ جمی ہوئی تھی۔ برآمدے کے کنارے کے قریب کھڑے ہوئے لوگ پیچھے آ گئے۔ باغ میں بہت سے لوگ ڈر کر پیچھے بھاگ گئے۔آتشبازی تیز رفتاری سے گھومی۔ اس کا دائرہ دوپہر کے سورج کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اتنا شور پیدا کیا کہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے پھٹ جائے گی۔ میں بھی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا لیکن کولا سوریا سکون سے بیٹھا رہا جیسے وہ بہرا ہو۔

’’کولا سوریا، میں تمہارے ماضی کو کھنگالنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ میں صرف تمہاری شادی اور اس قسم کی چیزوں کے متعلق کچھ سننا چاہتا تھا۔‘‘

’’جب میں نوجوان تھا تو مجھے دو دفعہ محبت ہوئی۔ ایک لڑکی کو تو مجھ سے شدید محبت تھی۔ وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ میں اس کی نظروں کے سامنے سے پل بھر کے لیے بھی ہٹوں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے لیے میری محبت کم ہوتی گئی۔ ایک سال کے اندر میں دوسری لڑکی کو بھی بھول گیا۔ رشتے کروانے والے کی منتخب کردہ لڑکی سے میں نے تقریباً دو سال بعد شادی کی۔‘‘

میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ میری زندگی بھی کسی حد تک کولا سوریا جیسی ثابت ہو رہی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ رشتے کروانے والے کی منتخب کردہ بیوی کو اپنے سر پر سوار کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

بارہواں باب

سروجنی کے لیے میری محبت رفتہ رفتہ پوری طرح غائب ہوگئی۔ اسے کھونے پر مجھے جو تکلیف ہوئی تھی اس نے کوئی مستقل نشان نہیں چھوڑا۔ میں چیزوں سے لاتعلق ہوتا چلا گیا۔ مجھے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ میں نے کیا پہن رکھا ہے اور اکثر مجھے اس وقت تک اس بات کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ میں کتنا گندا ہوں جب تک مینا اس قسم کی کوئی بات نہ کہتی: ''تمہاری بنیان کتنی غلیظ ہے!'' ایک دن اسے پتا چلا کہ میں نے دن میں تین چار مرتبہ پان کھانے کی عادت ڈال لی ہے۔

''میں نے سگار یا سگریٹ پینے کی عادت نہیں ڈالی لہٰذا میں نے یہ عادت اپنا لی۔''

''کب سے؟'' وہ ایسے مسکرائی جیسے جانتی ہو۔ اس وقت تو تمہیں یہ عادت نہیں تھی جب تم سارا کے گھر جایا کرتے تھے!''

اسے پورا یقین تھا کہ مجھے اب تک سروجنی کو کھو دینے کا رنج ہے۔ میری کوئی بھی بات اسے اس خیال سے نجات نہیں دلا سکتی تھی۔ اگرچہ ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے لیکن اس کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرا دماغ کس طرح کام کرتا ہے۔

میں دوبارہ سے کیمیا گری، جادو اور منتروں کے مطالعے کی طرف مائل ہو گیا، حتیٰ کہ میں نے مذہبی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔ میں نے جلد ہی کیمیا کی کتابوں میں دیے گئے تجربے کرنے شروع کر دیے۔ کام سے گھر آنے کے بعد میں گھنٹوں منتر پڑھنے یا کیمیائی

مادوں کو مختلف طریقوں سے ملانے میں گزارتا۔

ایک سہ پہر مینکا نے میرے کمرے کی صفائی شروع کردی۔ ہر طرف کیمیائی مادوں کی بوتلیں اور کاغذ کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ اولا کے پتوں پر لکھے پرانے مسودات اور گرد سے اٹی ہوئی کتابیں بدنظمی میں اضافہ کررہی تھیں۔

''یہ تو ساحل سمندر پر پھیلا ہوا کچرا معلوم ہورہا ہے۔'' اس نے کہا۔''اور تم ہر طرف پان کی پیک تھوکتے رہتے ہو۔ اگالدان کے باہر حتیٰ کہ فرش پر بھی دھبے ہیں۔'' اس نے کمرہ صاف کیا اور اگالدان بھی دھویا۔

''تم کولاسوریا کے ساتھ اتنا وقت کیوں گزارتے ہو؟ وہ تو سبزیوں کے بورے کی مانند ہے۔''

''تو پھر وہ صبح شام دیہات کا چکر کس طرح لگاتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''چلو تو پھر اس میں اور سبزیوں کے بورے میں یہی فرق ہے۔''

''تم کیسے جان سکتی ہو کہ وہ حقیقتاً کیسا ہے؟ وہ میری جان پہچان والا واحد شخص ہے جو دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتا اور جو ہو چکا ہے اس پر پریشان نہیں ہوتا۔''

''تو پھر اس میں اور سبزیوں میں کیا فرق ہوا؟ صرف سبزیاں ہی ہر چیز سے اتنا لاتعلق ہوسکتی ہیں۔ مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہے کہ اس کا بیٹا اور بیٹی کبھی اس سے ملنے نہیں آتے۔''

''کولاسوریا کبھی اس کی شکایت نہیں کرتا۔''

''دیکھا! صرف سبزیاں ہی ایسی ہوسکتی ہیں۔''

بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ جب مینکا کے دماغ میں کوئی خیال آجاتا تو وہ مگرمچھ کی طرح اس کے ساتھ چپک جاتی۔

ایک دن دھماکہ خیز مواد بنانے کے لیے سرخ سنکھیا، پوٹاش اور کچھ دوسرے اجزاء کو ملا رہا تھا۔ تین بار پہلے بھی میں اس کا ناکام تجربہ کرچکا تھا لیکن اس دن یک دم سب کچھ گولے کی طرح بھک سے اڑ گیا۔

میری الماری کا ایک دروازہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں کی بہت زور دار کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ تقریباً ایک فٹ پرے دیوار کا ایک حصہ دھماکے سے داغدار ہو گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری صرف آدھی درمیانی انگلی ضائع ہوئی تھی۔

مینکا نے اس دفعہ میری واقعی خبر لی۔

''اگر تم نے زیادہ عرصہ یہاں قیام کیا تو تم سارا گھر تباہ کر دو گے۔ کیا تم پاگل ہو؟ میں نے تمہیں بارہا بتایا تھا کہ تم تباہی کی طرف بڑھ رہے ہو۔''

اس نے اولا کے پتوں پر لکھے ہوئے کچھ مسودے اور کیمسٹری کی کتابیں اٹھائیں اور انہیں گھما کر باغ میں پھینک دیا۔

''سارا کو اپنی قسمت کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ وہ تم سے بچ گئی۔ تصور کرو اگر اسے تم جیسے آدمی کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزارنا پڑتی!''

اس کی آخری بات سے مجھے شدید تکلیف پہنچی۔ سروجنی کو سری داس سے شادی کیے ہوئے بمشکل ایک برس ہوا تھا اور مینکا پہلے ہی مجھ سے پیچھا چھڑانے کے منصوبے تیار کر رہی تھی۔ وہ صرف موقعے کے انتظار میں تھی اور مجھے ارادتاً کچوکے لگا رہی تھی۔ یہ غصے کے دورے سے زیادہ کچھ تھا۔ اس نے میری کتابیں باہر اس لیے پھینکی تھیں کیونکہ وہ مجھے بھی گھر سے باہر پھینکنا چاہتی تھی۔

اس نے میری چوٹ کے بارے میں کچھ نہیں کہا حالانکہ ایسا ناممکن تھا کہ اس نے یہ دیکھا ہی نہ ہو کہ میری درمیانی انگلی غائب ہے۔ غالباً میری خاموشی سے تکلیف برداشت کرنے کی قوت نے اسے اپنے غصے پر شرمندگی محسوس کرنے پر مجبور کر دیا۔

اس نے میرے کمرے کی صفائی کرنے کے لیے ملازم بھیجا۔

''چلیے، بیل گاڑی آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا انتظار کر رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اسے کس نے بلوایا ہے؟''

''مالکن نے۔''

زخم پندرہ دن میں بھر گیا۔ میں ایک چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو گیا جو مجھے

کرائے پر مل گیا تھا۔ جب مینکا نے یہ دیکھا کہ میں کہیں اور جاتے ہوئے ہچکچا رہا ہوں تو ہو بہت نا خوش ہوئی لیکن اس نے ایسا ظاہر کرنے کی کوشش کی نہ کہ وہ مجھے روکنا چاہتی ہے۔

''مجھے واقعی افسوس ہے کہ تمہیں کسی اور گھر میں تن تنہا رہنا پڑے گا۔''

اس نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کہا۔''لیکن میرا خیال ہے ایسا ہونا ہی تھا۔ دھرم داس کو وہ چیزیں جو تم آج کل کہتے اور کرتے ہو پسند نہیں ہیں۔ مجھے بھی یہ ناپسند ہیں۔اس کے علاوہ میرا بچہ بھی ہے۔ وہ ہر وقت تمہارے کمرے میں رہتا ہے۔ ذرا سوچو اگر اس نے کسی بوتل سے اپنے منہ میں کچھ ڈال لیا تو کیا ہوگا؟''

''ہاں، یہ سچ ہے۔ میں نے کبھی اس کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ مجھے تین چار مہینے سے اندازہ تھا کہ تم نہیں چاہتیں کہ میں یہاں رہوں۔ میں اس کی کوئی وجہ نہیں سوچ سکا تھا۔ میں نے سری مل کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ میں اس لیے نہیں جا رہا کہ میں تم سے ناراض ہوں۔''

''وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آدھی کشش تمہاری بوتلوں، ترازو اور تصویروں والی کتابوں میں ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں جب تم سے ملنے آؤں تو مجھے اسے ساتھ لانا چاہیے۔فرض کرو اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی جو تم نے اس کے ہاتھ میں پکڑائی ہو! دھرم داس اس کو تمہارے گھر لے جانا پسند نہیں کرے گا۔ وہ ہر روز گھر واپس آ کر سب سے پہلے یہ پوچھتا ہے:''کیا سری مل دوبارہ اروندا کے کمرے میں گیا تھا؟''

''میں سمجھتا ہوں۔'' میں نے رنجیدگی سے کہا۔''اگر ممکن ہو تو اس کو کبھی کبھی ساتھ لے آیا کرنا۔ اور میں تو جب بھی یہاں آؤں گا اس سے مل ہی سکتا ہوں۔''

بیشک مینکا کے کردار کے کچھ برے پہلو تھے لیکن اس میں کچھ اچھائیاں بھی تھیں لہٰذا میں اس سے زیادہ عرصے تک واقعی ناراض نہیں رہ سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کو سمجھنے کی میری کوششوں نے مجھے انسانی فطرت کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دی اور مجھے اس قابل کیا کہ اچھائی اور برائی دونوں کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکوں۔

میرے ساتھ مینکا کے اس رویے کی وجہ اپنے بچے کے بارے میں اس کا خوف تھا۔ اس نے ایک اور حقیقت سے بھی پردہ اٹھا دیا تھا کہ دھرم داس اسے پریشان کرتا رہتا

تھا۔ اس نے مجھے یہ سب کچھ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟ میرا خیال ہے کہ اس کو ڈر تھا کہ میں اس کے شوہر کے ساتھ جھگڑا کروں گا۔

میرا چھوٹا سا گھر چاول کے کھیت کے ساتھ ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا۔ اس میں صرف دو کمرے اور ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ بڑا کمرہ بیٹھک تھا جسے ایک محراب نے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ دھان کے کھیت کی ایک جانب بنجر زمین تھی جو افق تک پھیلی ہوئی تھی جبکہ دوسری طرف ربڑ کے درخت تھے۔ وہ اتنے دور تھے کہ ان کے قریب کام کرتے ہوئے لوگ بھی بونوں جیسے دکھائی دیتے تھے۔

میں اپنے نئے گھر میں بہت خوش تھا۔ ''اب میں ایک ذمہ دار گھر والا ہوں۔'' میں کئی بار سوچتا۔ مجھے گھر کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ایک درمیانی عمر کی گوناوتی نامی عورت مل گئی۔ اس کی ایک قریب آٹھ برس کی بیٹی بھی تھی۔ گھر میں بچے کی موجودگی مجھے بہت خوشگوار معلوم ہوئی۔

ایک مرتبہ جب دفتر سے واپسی پر میں تھکا ہارا بستر پر گرا تو میں نے اس بچی سے کہا: ''باتھی، میرے جوتے اتار دو۔'' وہ فوراً دوڑی دوڑی میرے پاس آئی، بستر کے قریب بیٹھ گئی، جوتوں کے تسمے کھولے، انہیں اتارا، میری جرابیں اتاریں، انہیں جوتوں میں گھسیڑا اور جوتوں کو ریک پر رکھ دیا۔ یہ بات یہاں ختم نہ ہوئی۔ وہ یہ عمل ہر روز دہراتی۔ میں کام سے واپس آنے کے بعد جیسے ہی کہیں بیٹھتا وہ مجھ پر جھپٹ پڑتی۔ اسے یہ بتانا بے سود تھا کہ میں خود اپنے جوتے اتار لوں گا۔ اس نے اور بھی بہت سے طریقوں سے خود کو کارآمد بنا لیا۔ وہ بہت محنت سے سارے گھر میں سے میرے پھینکے ہوئے کاغذوں کے ٹکڑے اٹھاتی اور ان کو کھاد والے گڑھے میں ڈال دیتی۔ ایک دفعہ میں نے اسے اپنی میز کی جھاڑ پونچھ کرنے کے لیے کہا۔ اتنا کافی تھا۔ اس کے بعد میری میز اور میری کتابوں کی بھی روز جھاڑ پونچھ ہوتی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ انتھک ہے۔ وہ چاہے جتنا بھی کام کر لیتی ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش رہتی۔ غالباً یہ قوت اسے کئی نسلوں سے محنت مزدوری کرنے والے اپنے آباو اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔

''باتھی کتنا عرصہ سکول جاتی رہی ہے۔'' میں نے اس کی ماں سے پوچھا۔

''میں نے اسے ڈھائی برس سکول بھیجا۔ یہ آسان نہیں تھا۔ یہ میری شادی کے بارہ برس بعد پیدا ہوئی تھی۔ یہ ایک برس کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کا باپ چل بسا۔''

میں نے باتھی کو سکول بھیجا۔ وہ حساب میں بری نہیں تھی لیکن باقی سب کچھ اسے ایک عذاب دکھائی دیتا تھا۔ ہاں وہ سلائی اور دستکاری میں باقی سب بچوں سے اچھی تھی۔

کیمسٹری میں میری دلچسپی ختم ہونا شروع ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ میری انگلی کو لگنے والی چوٹ تھی۔ میں اس بدصورت ٹنڈ کی طرف پچھتاوے اور بعض اوقات غصہ کیے بغیر نہ دیکھ سکتا۔

مذہبی کتابوں اور مخفی علوم کا مطالعہ میرے ذہن پر طاری ہوتا گیا۔ جب میں ابھی سکول میں ہی تھا تو مجھے احساس ہو گیا تھا کہ صرف استادوں سے پڑھ کر کسی مضمون کا صحیح مطالعہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ بیشک منظّم مطالعے کے لیے راہنمائی ضروری ہوتی ہے تاہم میرے نزدیک اس کا نوکری حاصل کرنے کے لیے پڑھنے سے بہت گہرا تعلق تھا۔ مطالعے کا یہ پہلو مجھے سخت ناپسند تھا، غالباً ابا کے اصرار کے بعد سے۔

میں اولا کے پتوں پر لکھی ہوئی پرانی کتابوں کو کسی خزانہ ڈھونڈنے والے کی طرح تلاش کرتا اور ان میں اس طرح گم ہو جاتا جیسے کوئی کان کن ہیرے تلاش کر رہا ہو۔

مجھے امید تھی کہ میں شاید کسی ایسی دوا کا قدیم نسخہ تلاش کر لوں گا جس سے آدمی دو یا تین سو برس زندہ رہنے کے قابل ہو جائے یا پھر کیمیا گری کا کوئی ایسا فارمولا جس سے پیتل اور تانبے کو سونے میں تبدیل کیا جا سکے۔ پنڈت مارامی نے میری حوصلہ افزائی کی کہ میں تاریخی روایات اور اولا کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھوں جن میں مدفون خزانوں کے مخفی اشارے دیے گئے ہوتے ہیں۔

مینکا مجھ سے مہینے میں دو یا تین مرتبہ ملنے آتی۔ وہ اپنے ساتھ بیس یا تیس ناریل یا پھر آموں کی بوری لاتی۔ وہ باتھی کے ساتھ میری زیادہ ہمدردی پر خاصی مشتعل ہوتی اور اسے کپڑے دینے اور سکول بھیجنے پر مجھے جھڑکتی۔

''وہ تمہاری کیا لگتی ہے کہ تم اسے ضرور سکول بھیجو اور اس کے کپڑوں پر اتنا خرچہ کرو؟ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی ماں کہاں سے آئی ہے۔''

''کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ باتھی اچھی لڑکی ثابت ہوگی۔ وہ پڑھائی میں زیادہ اچھی نہیں ہے لیکن سلائی کڑھائی کے کاموں میں بہت ہوشیار ہے۔''

''انہوں نے تو اپنے لیے کبھی سکول کا خواب بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ تم صرف اپنا پیسہ ضائع کر رہے ہو۔ جب وہ بڑی ہوگی تو کسی نہ کسی کے ساتھ فرار ہو جائے گی۔'' اس نے اپنی بات کا خاتمہ حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ کیا۔

''اگر ایسا ہو بھی جائے تو پھر کیا ہے؟ جو چیزیں اس نے سیکھی ہیں وہ تو پھر بھی اس کے کام آئیں گی۔''

''اگر وہ ایسا کرے گی تو کیا تمہیں برا نہیں لگے گا؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں۔ میں ایسی کسی بات پر ناراض نہیں ہوں گا یہاں تک کہ اگر وہ میری اپنی بیٹی بھی ہو۔''

''میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہیں بھی کولا سوریا والی بیماری لگ گئی ہے۔'' اس نے قدرے غصے سے کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ اس آدمی سے تعلق نہ رکھو۔ وہ بہت بڑا منافق ہے۔ وہ ضرور اپنے پچھلے جنم کی کسی غلطی کی سزا بھگت رہا ہے۔''

''کولا سوریا منافق نہیں ہے۔''

''اگر وہ منافق نہیں ہے تو وہ بہر حال بد بخت ضرور ہے۔ اور اب تم بھی اس جیسے ہوتے جا رہے ہو۔ اپنے کپڑوں کی طرف دیکھو! تم ایک نوکرانی کی بیٹی پر پیسے ضائع کر رہے ہو لیکن تمہارے اپنے کپڑے غلیظ ہیں۔'' وہ خاصی پریشان نظر آ رہی تھی۔

''یہ اب اتنے بھی گندے نہیں ہیں۔ میں تجربے کرتا رہتا ہوں اور بعض اوقات جب میں واقعی مصروف ہوتا ہوں تو اپنے ہاتھ اپنی لنگی سے صاف کر لیتا ہوں۔''

وہ میری میز پر بکھری ہوئی چیزیں الٹنے پلٹنے لگی۔

''تم یہ الا بلا کیوں جمع کرتے ہو؟'' اس نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور صرف مسکرانے لگا۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ اب تم صرف اپنی من مانی کرتے ہو۔''

اس کی آنکھیں غالباً اس لیے غم زدہ تھیں کہ اس کے لیے یہ سوچنا تکلیف دہ تھا

کہ میرا مستقبل کیسا ہوگا۔ اس کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔

''تمہیں آزادی کا استعمال آنا چاہیے۔ تمہارا دماغ ایک پرندے کی طرح ہے جو ایک چیز سے اڑ کر دوسری پر بیٹھ جاتا ہے۔ ابا کی وفات نے تمہارا ماضی تباہ کر دیا۔ اب سارا نے تمہارا مستقبل تباہ کر دیا ہے۔ اگر تم نے توجہ نہ دی تو تم اپنی ساری زندگی برباد کرلو گے۔''

وہ کیا چیز تھی جو اسے اتنی سنجیدگی کے ساتھ مجھے سمجھانے پر مجبور کر رہی تھی؟ بیشک میں جس طرح باتھی پر پیسے خرچ رہا تھا وہ اس پر پریشان تھی۔

''محتاط ہونے کا کیا فائدہ جب آدمی کا نہ کوئی ماضی ہے اور نہ ہی کوئی مستقبل؟''

''اپنے لیے مستقبل بناؤ۔ تم اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کو آپس میں ملا دینے کی قیمت چکا رہے ہو۔''

''اگر میں ابا کی خواہش کے مطابق ڈاکٹر بن گیا ہوتا تو کیا واقعی میرا کوئی ماضی نہ ہوتا؟''

''پھر تمہارا مستقبل روشن ہوتا۔''

''جو شخص اپنے ماضی سے ناطہ توڑ لے اسے مستقبل کا سامنا کسی بے خانماں کی طرح ناخوش ہے۔ کچھ روز قبل اس نے باتھی کو مجھے ''ابا'' کہتے سنا تھا۔

ایسا باتھی کے سکول جانے کے ساتھ یا آٹھ مہینے کے بعد ہوا۔ میرا نہیں خیال کہ اس نے مجھے ''ابا'' اس لیے کہا تھا کہ اس کی ماں نے ایسا کرنے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ اسے یہ عادت سکول میں دوسرے بچوں سے میرے متعلق بات چیت کرتے ہوئے پڑی ہو۔ مجھے اپنا باپ کہنا اسے یقیناً ایک قدرتی چیز لگی تھی۔ شروع میں مجھے یہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

تاریکی چھا رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر لیمپ جلا دیا۔ مینکا کو اندازہ نہیں ہوا تھا کہ کتنی دیر ہو چکی ہے لہٰذا وہ جلدی سے باہر چلی گئی۔ بیل گاڑی جو سیڑھی کے بالکل قریب روکی گئی تھی اب چند گز دور کھڑی تھی۔ بیل ایک کیلے کے پیڑ پر منہ مار رہا تھا جبکہ گاڑی بان سیٹ پر پاؤں پھیلائے لیٹا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔ مینکا نے اسے آواز دی: ''جامس۔'' لیکن اس کے خراٹے جاری رہے۔ بیل نے اس کی آواز پہچان لی اور اس کی طرف دیکھنے کے

لیے پیڑ سے گردن موڑ لی۔ اس کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

''جامس۔''

جامس ایک جھٹکے کے ساتھ کسی کٹھ پتلی کی طرح سیدھا ہو گیا اور باگیں اکٹھی کرنے لگا۔

میں ان کو جاتے دیکھتا رہا یہاں تک کہ بیل گاڑی تاریکی میں غائب ہو گئی۔ دور کی جھاڑیوں سے پھولوں کی تیز خوشبو مجھ تک پہنچی اور میرے نتھنوں میں گھس گئی۔ اس نے گھاس اور زمین سے اٹھنے والی زیادہ خوشبوؤں کو اپنے میں مدغم کر لیا۔ میں نے مینکا کے لیے غصے کی بجائے ایک قسم کا ترحم محسوس کیا۔ اس کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کر کے میں نے زندگی کے بارے میں وہ بصیرت حاصل کر لی تھی جو میں اپنی کتابوں سے کبھی نہیں حاصل کر سکتا تھا۔

جب گھنٹیوں کی ٹن ٹن تقریباً ختم ہو گئی تو باتھی چپکے سے گھر سے باہر آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر سڑک کو دیکھنے لگی۔

تیرہواں باب

کولاسوریا ایک خانہ بدوش کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ مینکا کو ڈر تھا کہ میں بھی سماج سے کٹ جاؤں گا۔ اسی لیے اس نے کہا تھا: ’’میں دیکھ رہی ہوں کہ تمھیں بھی کولاسوریا والی بیماری لگ گئی ہے۔‘‘

کولاسوریا سماج کو نظر انداز کرتا تھا۔ وہ صرف چند لوگوں کو جانتا تھا اور انہیں ہمیشہ افراد سمجھتا تھا، صرف سماج کی اکائیاں نہیں۔

اگر میں دو یا تین دن اسے ملنے نہ جاتا تو وہ خود ملنے آجاتا۔ جوں جوں ہماری دوستی بڑھی ہم سماج سے مزید کٹتے گئے۔

اس نے میری حوصلہ افزائی کی کہ میں باتھی کو سکول بھیجوں حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مینکا مجھے دھمکاتی رہی ہے کہ ایسا نہ کروں۔

’’لوگ اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنے کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ آخر کار ان پر پوری طرح انحصار کرنے لگتے ہیں۔ اسی لیے جب وہ بوڑھے یا بیمار ہو جاتے ہیں اور انہیں توقع کے مطابق پوری توجہ نہیں ملتی تو وہ شکایت کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے سادھو سنتوں کی طرف دیکھو۔ وہ اس قسم کی کسی چیز کی توقع نہیں رکھتے لہٰذا خود کو تکلیف سے بچا لیتے ہیں۔‘‘

’’فرض کرو تم بیمار ہو گئے تو کیا ہو گا؟‘‘

’’اس سے کون ڈرتا ہے؟ اگر صحت یاب نہیں ہوئے تو ہم مر جائیں گے اور مجھے

مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔ موت تب ڈراؤنی ہوتی ہے جب آدمی جوان ہوتا ہے۔ جوان لوگ سوچتے ہیں کہ زندگی اور موت میں بہت بڑا فرق ہے۔ جب آپ بوڑھے ہوتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ خوشی اور غم کے بارے میں بات کرنا بیکار ہے۔ اس پر تو شاید بات ہو سکتی ہے کہ آپ کے پاس کیا ہے اور کیا نہیں لیکن خوشی اور غم پر نہیں۔''

''زیادہ تر لوگ ایسے نہیں سوچتے۔''

''لیکن ہم تو ایسا کر سکتے ہیں!'' وہ ہنسا۔

''تو پھر کیا تم سمجھتے ہو کہ شادی نہ کرنا ہی سب سے بہتر ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا۔''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ شادی کرتے ہیں یا نہیں۔ اس سے کیا فرق پڑنا ہے؟''

کیا اس نے بھانپ لیا تھا کہ میرے دماغ میں کیا بات ہے؟ یا وہ مجھے اپنے خیالات اور نظریات کے حوالے سے پرکھنے کی کوشش کر رہا تھا؟ میرے خیالوں سے سروجنی کی شبیہہ دھندلی ہونے کے بعد میرا دماغ کولا سوریا کی طرف یوں کھنچ گیا جیسے سوئی مقناطیس کی طرف۔

ایسا نہیں تھا کہ ہماری زندگیاں ایک جیسی تھیں۔ اس کی شادی ہوئی تھی اور اس نے مکمل علیحدگی کی زندگی اپنے بیوی بچوں کی ذمہ داریاں نبھانے کے بعد ہی اختیار کی تھی۔ پرانے وقتوں میں ایسے لوگ جنگلوں میں چلے جاتے تھے اور اپنی زندگی کے باقی دن گوشہ نشینی میں گزارتے تھے۔

میں نے کولا سوریا کے بارے میں جو مختلف باتیں سنی تھیں انہیں جوڑ کر اب میں اپنے دماغ میں اس کی زندگی کا خاکہ بنا سکتا تھا۔ میرے برعکس وہ سکول میں بہت اچھا طالب علم نہیں تھا اور پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ سینئر امتحان کے بعد اس نے پوسٹ ماسٹری کا امتحان دیا تھا اور پوسٹ ماسٹر بن گیا تھا، بالکل اسی طرح جیسے میں کلرکی کا امتحان دے کر کلرک بن گیا تھا۔ اس نے اپنے والدین کی تمام خواہشات کا احترام کیا تھا اور گھر اور گھر سے باہر دونوں جگہ ایک بھرپور مثالی زندگی گزاری تھی۔ اس کے والدین نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ ان کا بیٹا ایک دن ایسی بے خانماں زندگی گزارے گا۔

اسے بھی میری طرح دوستوں کے ساتھ رہنے کا کچھ خاص شوق نہیں تھا۔ اس نے صرف ایک مرتبہ اپنی شادی والے دن شراب چکھی تھی۔ وہ میری طرح پورے خلوص سے مذہبی تھا لیکن اب وہ مذہب سے بھی لاتعلق ہو چکا تھا۔ ایسا کیوں ہوا کہ وقت کے ساتھ اس کے اعتقاد میں اضافہ نہ ہوا؟

اس نے ایسی زندگی گزاری تھی جس کی والدین اور ناصح تلقین کرتے ہیں۔ اور پھر بھی ہر کوئی، بشمول مینکا، اسے ایک ایسا آوارہ گرد قرار دیتا تھا جسے مہذب معاشرے سے خارج کیا جا چکا ہو۔

وہ جب بھی آتا باتھی خوشی سے دوڑتی ہوئی اس کے پاس جاتی، اس سے باتیں کرتی، ہنستی حتیٰ کہ اسے جھڑک بھی دیتی۔ وہ کبھی اس سے اس کے والدین کے متعلق نہیں پوچھتا تھا۔

''گھر کے کام کاج میں اچھی ہے؟'' اس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کام میں ہوشیار ہے اگرچہ پڑھائی میں کچھ خاص اچھی نہیں ہے۔''

''کتابوں سے سیکھی جانے والی ہر چیز زندگی سے بھی سیکھی جا سکتی ہے۔ صرف بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ اپنے ہوش وحواس قائم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب آپ اس مقام پر پہنچتے ہیں تو آپ کو پتا چلتا ہے کہ زندگی نے خود آپ کو وہ سب کچھ سکھا دیا ہے جو آپ کو جاننے کی ضرورت ہے۔ اور یہ سارا کتابی علم تجربے سے سیکھنے کی پیش بندی کی کوشش ہے۔ جب آپ ذہنوں کو ان کے وقت سے پہلے پکنے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ اتنی ہی جلدی گل سڑ جاتے ہیں۔ لوگوں کو اس نقصان کے بارے میں صرف تب پتا چلتا ہے جب وہ اتنے بوڑھے ہو چکے ہوں کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کر سکیں۔ بڑی ہو کر باتھی تمہاری خوب دیکھ بھال کرے گی۔''

''لیکن جب یہ بڑی ہوگی تو کسی جوان آدمی کی محبت میں گرفتار ہو کے اس کے ساتھ بھاگ جائے گی۔'' میں نے مینکا کی بات یاد کرتے ہوئے کہا۔

''ادھر آؤ۔'' کولا سوریا نے باتھی کو بلایا جو زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ ہنستی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔

''اگر یہ کسی نوجوان آدمی کے ساتھ بھاگ گئی تو تم صرف یہ کر سکتے ہو کہ اس کے ساتھ اس کی شادی کرا دو!'' کولا سوریا نے ہنستے ہوئے کہا۔

میری نظر دو آدمیوں پر پڑی جو گھر سے کچھ فاصلے پر سبزیوں کے کھیت کی کھدائی اور صفائی کر رہے تھے۔ یہ منظر مجھے واپس ماضی میں لے گیا جب ان دو مزدوروں نے ہمارے گھر میں ابا کی وفات کے کچھ عرصے بعد ان کی تعریف کی تھی۔ ان کی باتوں نے ابا کے کردار کے ایک پہلو پر روشنی ڈالی تھی۔ ابا نے آیورویدک وید بننے سے قبل ہر قسم کے قابل اعتراض کام کیے تھے۔ لیکن وہ اپنی کمائی ہوئی رقم سے دیہاتیوں کو قرض دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ابا کے کچھ منصوبے تو میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ وہ یہ سب کچھ صرف پیسہ کمانے کے لیے نہیں کرتے تھے۔ یقیناً انہیں اس کی کوئی اشد ضرورت ہوگی۔ مینکا نے مجھے حال ہی میں بتایا تھا کہ کس طرح ابا نے ایک مرتبہ کپڑے دھونے والے صابن کی کئی ٹکیاں خریدی تھیں، انہیں چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑوں میں کاٹا تھا، انہیں تب تک پتھر پر رگڑا تھا جب تک ان کی چھوٹی چھوٹی گولیاں نہیں بن گئی تھیں، انہیں رنگا تھا اور پھر رنگین کاغذ میں لپیٹ کر بیچ دیا تھا۔ ایک اور موقعے پر انہوں نے کچھ انگوٹھیاں لی تھیں جو اندر سے جولاد اور باہر سے پیتل کی تھیں، انہیں شوربے کے تیزاب میں ڈبویا تھا اور ''شفائی انگوٹھیاں'' کہہ کر بیچا تھا۔ بظاہر انہیں یقین تھا کہ یہ انگوٹھیاں پہننے والوں کے درد اور تکلفیں دور کر دیں گی۔ وہ چیزیں ایجاد کرنے کے جنون کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔

مجھے صرف کپڑوں اور کھانے اور باتھی کے سکول کے خرچ کے لیے پیسے چاہیے ہوتے تھے۔ بطور کلرک میں جو پیسے کماتا وہ ضرورت سے زیادہ ہوتے۔ پھر میں پیتل کو سونے میں بدلنے کے لیے اتنا بے چین کیوں تھا؟ کم از کم پیسوں کی محبت کی وجہ سے تو نہیں۔ اور میں اولا کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو ایسے کیمیائی مرکبات کے فارمولوں کے لیے جو آدمی کو ایک سو یا دو سو سال زندہ رہنے کے قابل بنا دیتے ہیں اس لیے نہیں کھنگالتا رہتا تھا کیونکہ میں امیر ہونا چاہتا تھا۔ مجھے دو سو برس حتیٰ کہ سو برس کی عمر تک زندہ رہنے کی ذرا بھی خواہش نہیں تھی۔ میرے مذہبی کتابوں اور یوگا کے مطالعے کا موجب بھی ان پر کسی قسم کا اعتقاد نہیں تھا بلکہ ہوا میں اڑنے کی طاقت حاصل کرنے کی میری خواہش تھی۔ جب

میں بچہ تھا تو اکثر خواب دیکھا کرتا تھا کہ میرے پاس یہ طاقت ہے۔ میں اپنے خوابوں میں اڑتا اور پانی پر چلتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے خواب دیکھا کہ مجھے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے اور میں نظروں سے اوجھل ہو کر فرار ہو جاتا ہوں۔

کولا سوریا کو ان فارمولوں اور ترکیبوں میں دلچسپی نہیں تھی جو میں ہر وقت پڑھتا رہتا تھا۔ جب میں ان کے متعلق کوئی بات کرتا تو وہ ان سنی کر دیتا اور ہر مرتبہ مجھ سے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کر دیتا جس کا میری بات سے دور کا بھی تعلق نہ ہوتا۔ اس نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ اس کا کل مطالعہ جوانی کے دنوں میں کبھی کبھار جاسوسی ناول پڑھنے تک محدود تھا۔ اسے بنیادی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی میری دلچسپی کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔

سروجنی دو مرتبہ سری داس کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی۔ ایک اور موقعے پر وہ اکیلی آئی۔ اس کے آنے نے مجھے بے آرام ہی کیا اور اس سے یہ کیفیت چھپانے کے لیے مجھے خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔

بعض اوقات میں سوچتا کہ وہ میری موجودہ زندگی پر طعنہ زنی کرنے آتی ہے۔ کیا وہ اس قسم کی خوشی حاصل کرنے کے لیے آتی ہے جو کسی شکاری کو اپنے شکار کیے ہوئے ہرن کو دیکھ کر ملتی ہے؟ وہ ظالم عورت نہیں ہے لیکن اس کی ہمدردی مجھے صرف ناراض کرتی ہے۔ یا پھر کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جب وہ میری موجودہ زندگی کو دیکھتی ہے تو اس کا ضمیر اسے مجرم گردانتا ہے؟ اس کی ہمدردی مجھے زچ کر دیتی اور مجھے اپنے جذبات چھپانے کے لیے بہت کوشش کرنا پڑتی۔

رفتہ رفتہ میں نے اپنی موجودہ زندگی کو پسند کرنا شروع کر دیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس احساس کا اس امر سے کوئی تعلق نہیں کہ مجھے سروجنی سے محروم ہونا پڑا۔ اس نے میرے اندر جو جذبہ ابھارا تھا وہ حقیقی محبت یا جنون جیسی کوئی چیز نہیں تھی، بلکہ یہ صرف سروجنی کے لیے ایک رومانوی طور پر غیر واضح چاہت تھی: ایک بے جوش جذبہ۔

مینکا سمجھتی تھی کہ میں سروجنی کو پا نہیں سکا تھا اس لیے تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا اور اپنا تمام پیسہ اپنی ملازمہ کی بیٹی کے کپڑوں اور کھانے پر خرچتا تھا۔ غم نے مجھے اپنے

کپڑوں سے بے پرواہ کر دیا تھا، اس نے مجھے آخری حد تک نا امید کر دیا اور ہر چیز سے لاتعلق بنا دیا تھا۔ وہ اسے یوں دیکھتی تھی۔ سروجنی مینکا جتنی خودرائے نہیں تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس کی رائے بھی میرے بارے میں ایسی ہی ہے۔

''سری داس کہتا ہے کہ اس کی نظر میں ایک اچھی اور تعلیم یافتہ لڑکی ہے جو تمہارے لیے موزوں رہے گی۔'' سروجنی مجھ سے ملنے آئی تھی۔

اس نے اتنا خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا کہ میں نے حیرت سے خود سے پوچھا کہ آیا وہ صرف اس لیے اس طرح بنی سنوری ہوئی ہے کہ اس لڑکی میں میری دلچسپی پیدا ہو سکے جس کی وہ بات کر رہی ہے۔ سری داس کا گھر آدھے میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اتنے کم فاصلے پر مجھ سے ملنے آنے کے لیے سروجنی نے ریشمی ساڑھی اور خوبصورت بلاؤز کیوں پہنا تھا؟ اسے موتیوں کا ہار اور بندے اور کڑے پہننے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ غالباً میری حیرت کو بھانپ کر سروجنی نے کہا:

''میں اس لڑکی کے گھر سے سیدھی ادھر آ رہی ہوں۔ سری داس میرے ساتھ اس لیے یہاں نہیں آیا کیونکہ اسے ایک آدمی کے ساتھ کاروباری بات چیت کرنا تھی جو اچانک آ گیا تھا۔''

''میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نہ تو کسی سے محبت کر سکتا ہوں اور نہ ہی نفرت۔ اب تو مجھے یہ بھی پتا نہیں کہ آیا میں تم سے واقعی محبت کرتا تھا یا نہیں۔ مجھے نہ ہی اس چیز کی خوشی ہوتی ہے اور نہ ہی غم۔ اگر کوئی ایسی چیز ہے جو مجھے ہر چیز سے بیزار کر دیتی ہے تو وہ یہ حقیقت ہے کہ تم مجھ پر رحم کھاتی ہو۔''

میری بات سنتے ہوئے وہ مسکرانے لگی۔ اس نے صرف یہ کہنے کے لیے میری طرف دیکھا: ''مجھے تمہارے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ مجھے شدید غصہ آ رہا ہے۔ ''تمہارا خیال ہے کہ تمہاری سری داس کے ساتھ شادی کی وجہ سے میں پاگل ہو گیا ہوں؟ تم......'' یہ الفاظ میری زبان پر آ رہے تھے گو میں نے کچھ نہ کہا۔ اگر میں نے کچھ کہا ہوتا تو اس نے اور سری داس دونوں نے یقیناً اس بات کو میرے پاگل پن کا ثبوت سمجھا ہوتا۔ کہیں وہ میرے غصے کو محسوس نہ

کر لے! اس خیال سے میں نے مسکرانے کی پوری کوشش کی۔

''کیا تمھیں اس بچی کا ابا کہنا اچھا لگتا ہے؟'' سروجنی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے تیزی سے اس کی طرف دیکھا۔ میری حیرت کا اظہار یقیناً میری آنکھوں سے ہو گیا ہوگا کیونکہ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کی آمد کے پیچھے کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ باتھی ہمیشہ سروجنی کی آمد کے دوران خود بخود چھپ جاتی تھی۔ سروجنی نے کبھی باتھی کو مجھے ابا کہتے نہیں سنا تھا۔

''تمھیں کیسے پتا چلا کہ باتھی مجھے ابا کہتی ہے؟ یقیناً مینکا نے تمھیں بتایا ہوگا۔''

وہ مسکرانے لگی۔

''تم نے میرے لیے بیوی ڈھونڈنے کا فیصلہ یقیناً میرے متعلق اس سے بات چیت کرنے کے بعد کیا ہوگا۔''

''نہیں، اسے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ سری داس نے اسے بتانے سے منع کیا ہے۔''

''تو کیا یہ سری داس کا منصوبہ ہے؟''

''نہیں، ہم دونوں کا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا منصوبہ ہے۔''

اب میں زیادہ رنج اور غصہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ سری داس اور سروجنی اس لیے مجھ پر رحم نہیں کھا رہے ہیں کہ ان کے خیال میں پاگل ہوں۔ وہ باتھی کے مجھے ابا کہنے کی عادت پر پریشان تھے۔ مینکا، سری داس اور سروجنی نے یقیناً اس پر بات کی تھی اور محسوس کیا تھا کہ یہ صورت حال ان کے لیے بھی رسوائی کا باعث بن سکتی ہے۔ لیکن سروجنی نے ابھی تک مینکا کی طرح چیزوں کو کھلم کھلا بیان کرنا نہیں سیکھا تھا۔

اگر باتھی مجھے ابا کہتی ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ میں اس کی ماں کا شوہر ہوں! مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ باتھی کی ماں کم از کم بچاس برس کی تھی۔

مینکا نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا کہ وہ خوفزدہ ہے کہ میں سماج سے کٹ جاؤں گا۔

''میں نہیں جانتا کہ باتھی نے ایسا کہا ہی کیوں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''شروع

میں میں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اب میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔''

''میں پھر کسی دن بات چیت کرنے آؤں گی۔'' اس نے جاتے ہوئے کہا۔

''اگر تم مجھے بات چیت کے ذریعے شادی پر آمادہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہو تو نہ آنا۔'' میں نے قدرے ترشی سے کہا۔

بارش سے بھیگے ہوئے درختوں اور زمین کا بوسہ لیتی ہوئی ہوا نے اس کی ساڑی کا پلو پکڑ لیا اور اسے میری طرف یوں اٹھا دیا جیسے وہ مجھ تک پہنچنا چاہتا ہو۔ اس نے تیزی سے بیل گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنے بالوں کو ہوا سے بکھرنے سے بچانے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی لال بیل گھنٹیاں ٹن ٹناتا ہوا چل پڑا اور اس نے ایک کوے کو ڈرا دیا جو باڑ کے کونے میں پڑی ہوئی گیند کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ کوا فوراً اڑ گیا۔

باتھی برآمدے میں آ گئی۔

''تم پہلے باہر کیوں نہیں آئیں؟''

''میرا خیال تھا آپ پسند نہیں کریں گے۔''

''کیا تم اس عورت سے ڈرتی ہو؟''

''نہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''مجھے تو وہ اچھی لگتی ہیں۔''

لیکن اس نے کبھی سروجنی یا مینکا سے بات چیت نہیں کی تھی۔ اسے کیا پتا کہ جب وہ مجھ سے ملنے آتی ہیں تو کس چیز کے متعلق بات کرتی ہیں۔ اسے کس چیز نے مینکا سے ڈرنے اور سروجنی کو پسند کرنے پر مجبور کیا؟ اس کے احساسات خالصتاً فطری تھے۔

''جب کولا سوریا یہاں آتا ہے تو کیا تم اس کے ساتھ خوب باتیں نہیں کرتی؟''

اس نے کچھ بھی نہ کہا۔

مینکا کو یہ اندازہ کیسے ہوا کہ میں نے تانبے کو سونے میں بدلنے کا فارمولا ڈھونڈ لیا ہے؟ میں ہمیشہ صبح کو اپنے کمرے کے دوروازے کو تالا لگاتا اور چابی اپنے ساتھ دفتر لے کر جاتا تھا لہٰذا وہ میری غیر موجودگی میں میری کتابیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ اس نے میری میز پر پڑا ہوا ایک فارمولا اٹھایا تھا۔ میں نے اسے فوراً چھین لیا

تھا اور اپنی میز کی دراز میں رکھ کر تالا لگا دیا تھا۔

میں نے اس فارمولے کو دراز سے نکالا۔ میری نظر اس کے آخر میں لکھے ہوئے ''سونا بنانے کا فارمولا'' پر پڑی۔ اس کے نیچے ''اودیشا تنترا'' لکھا تھا۔ یہ اس کتاب کا نام تھا جس سے میں نے یہ فارمولا نقل کیا تھا۔

بلا شبہ مینکا نے بھی اس فارمولے کی سرخی پڑھ لی ہوگی۔ اس کا خیال ہوگا کہ اگر میں نے سونا بنا لیا تو باتھی اور گوناوتی اس پر قبضہ کر لیں گی۔ سری مل آٹھ برس کا تھا۔ اس کا دن کا زیادہ حصہ سکول میں گزرتا تھا۔ اس بات کا امکان نہیں تھا کہ اب میرے تجربے اسے نقصان پہنچا سکیں۔ درحقیقت مینکا اب مجھے واپس اپنے گھر لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

باتھی روزانہ میرا کمرہ صاف کرتی تھی۔ وہ میرا بستر اور تکیہ جھاڑتی اور فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کرتی۔ وہ میری ضرورت کی تمام چیزوں کو ان کی صحیح جگہوں پر رکھ دیتی۔ میں جونہی کام سے واپس گھر آتا وہ میرے جوتے اور جرابیں اتارتی۔ وہ ہفتے میں ایک مرتبہ میرے جوتے پالش کرتی اور میری جرابیں ہمیشہ گندی ہونے سے پہلے دھو دیتی۔ وہ میری دیکھ بھال کرنے کی کوششوں میں اپنے جسم و جان کی پرواہ کیے بغیر اتنا کچھ کر رہی تھی کہ میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ آیا میں تن آسان تو نہیں ہوتا جا رہا۔ میں اس دیکھ بھال کا اتنا عادی ہو رہا تھا کہ اس کے بغیر زندگی ناممکن نظر آتی تھی۔

چودھواں باب

جب تک باتھی آٹھویں جماعت میں پہنچی وہ سلائی کڑھائی اور بہت سی دوسری دستکاریوں میں ماہر ہو چکی تھی۔ وہ اٹکے بغیر سنہالی کی کوئی کلاسیکی کتاب نہیں پڑھ سکتی تھی لیکن مجھے پتا چلا کہ وہ گھٹیا شاعری پڑھتی ہے اور اسے نقل کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ گھر میں سوائے چند کلاسیکی کتابوں کے شاعری کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ جہاں تک مجھے علم تھا باتھی نے ان کتابوں کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ اسے اخبار میں شاعری پڑھنے کا شوق سکول میں اپنی سہیلیوں کو دیکھ کر پیدا ہوا ہوگا۔ اسے اخبار میں شاعری پڑھ کر یہ شوق پیدا نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ میں صرف ایک اخبار لیتا تھا اور وہ انگریزی کا تھا۔

لیکن حقیقت سے فرار ممکن نہیں تھا۔ مجھے اس کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے چار شعر ملے جنہیں پڑھ کر مجھے شدید غصہ اور شرمندگی محسوس ہوئی۔ انہیں جنسی نظمیں نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن وہ عنفوان شباب کی محبت بھری آرزوؤں سے بھرپور تھیں جن کا اظہار بھونڈے اور بچگانہ الفاظ میں کیا گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ باتھی جسے اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا اتنا جنون تھا شاعرہ بننا چاہتی ہے۔ میں نے اس کاغذ کو پھاڑ کر اس کے ٹکڑے باہر پھینک دیے۔ وہ باغ میں تتلی کے ٹوٹے ہوئے پروں کی طرح لہرائے۔

میں نے باتھی کو ڈانٹا نہیں۔ وہ یہ نہ جان سکی کہ میں کسی وجہ سے ناراض ہوں۔ میری طرف چپکے سے دیکھنے کے بعد اس نے اپنا سر جھکا دیا اور اپنی نظریں زمین میں گاڑ دیں۔ وہ مسکرائی لیکن اس کے چہرے سے نہ ہی خود اطمینانی کا اظہار ہوتا تھا اور نہ ہی

ندامت کا۔

نو برس پہلے وہ صرف چھوٹی سی بچی تھی جو مجھے ہر طرح سے خوش کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اب وہ بدل چکی تھی! اس کے گال بھر کر گول ہو چکے تھے، اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اوراس کے ہونٹ بھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے قدرے جدا تھے۔ اس کا جسم بھر چکا تھا اور زندگی سے بھرپور دکھائی دیتی تھی۔ میرا خیال ہے اس کے جسم میں اتنی زیادہ تبدیلی پچھلے دو یا تین برس کے درمیان ہی واقع ہوئی تھی۔ اب وہ تب تک گھر کے کام کاج نہیں کرتی تھی جب تک میں اسے نہ کہتا۔ وہ گوناوتی کی بات تو بالکل نہیں سنتی تھی اور اس کا ''بیٹی'' کہنا سخت ناپسند کرتی تھی۔ اب بھی میرے کمرے کی دیکھ بھال وہی کرتی تھی لیکن وہ اپنا زیادہ وقت بننے سنورنے اور اس بات کا خیال رکھنے میں صرف کرتی تھی کہ اس کے کپڑے صاف اور حلیہ درست ہے یا نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی بات مجھے ناخوش نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس کے شعروں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نابالغ ہے اور شائستگی کے لبادے میں خاصی شہوت پرست۔

''تم نے نظمیں لکھنا کیسے سیکھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں نے نظمیں لکھنا نہیں سیکھا۔''

''تم سیکھے بغیر شعر نہیں کہہ سکتیں۔ میرے پاس گھر میں نظموں کی کتابیں بھی نہیں ہیں۔ تم نے وہ کس طرح حاصل کیں؟''

''میں سکول میں شاعری کی کتابیں پڑھتی ہوں۔''

''میری مراد چھوٹے بچوں کے لیے لکھی جانے والی شاعری کی کتابوں سے نہیں ہے۔ تم نے اپنے شعروں میں بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو صرف گھٹیا شاعری کی کتابوں سے ہی سیکھے جا سکتے ہیں!''

''سکول کی لائبریری میں شاعری کی بہت سی کتابیں ہیں۔ میں وہ پڑھتی ہوں۔''

''کیا تم نے وہ پرانی نظمیں پڑھی ہیں جو میرے کمرے میں رکھی ہیں؟''

''نہیں۔''

''کیا تم نے اس سے پہلے بھی شعر لکھے ہیں؟''

اس نے کچھ مایوسی سے اوپر دیکھا۔ اس کے چہرے سے نظر آتا تھا کہ میرے سوال نے اسے پریشان اور خوفزدہ کر دیا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا اس نے واقعی شاعری کا فن سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خوفزدہ کیوں ہو رہی تھی؟

''میں نے دو یا تین مرتبہ شعر لکھے ہیں۔'' اس نے کچھ وقفے کے بعد کہا۔ اس کی انکھوں میں ابھی تک خوف تھا۔

''اپنا وقت ایسی بکواس لکھنے پر ضائع مت کرو!'' میں نے اسے حکم دیا۔ اس نے باغ میں جا کر کاغذ کے ٹکڑے جمع کیے اور کھاد والے گڑھے کی طرف چلی گئی۔ ہوا سے ایک نامانوس خوشبو مجھ تک پہنچی۔ یہ صابن یا پاوڈر کی خوشبو نہیں تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ باتھی نے کوئی خوشبو لگائی تھی۔

ایک لڑکی جو میرے جیسے گھر میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ہو اسے ایسی عادتیں کیسے پڑ سکتی ہیں؟ اس گھر میں آباد ہونے کے بعد تو میں نے ٹالکم پاوڈر کا استعمال بھی ترک کر دیا تھا۔ بہت عرصے سے میں سادہ اور پرانے انداز کے دیسی صابن کے سوا کچھ استعمال نہیں کر رہا تھا۔ باتھی نے خوشبو دار صابن اور پاوڈر استعمال کرنے کی عادت ڈال لی تھی لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک آگے چلی جائے گی کہ خوشبو لگانے لگے۔

باتھی سے میری ناراضگی جلد ہی دور ہو گئی لیکن شرمندگی کا ایک احساس برقرار رہا۔ میں مایوسی کی حد تک پریشان تھا کیونکہ باتھی اب جیسی بن چکی تھی وہ میرے لیے خاصا اذیت ناک تھا۔ اس کا ذمہ دار میں تھا کیونکہ اسے سکول بھیج کر میں نے ہی تبدیلی کا آغاز کیا تھا۔ اس کا مرحوم باپ محض ایک گاڑی بان تھا۔ آٹھ برس کی عمر تک وہ پوری طرح اپنی ماں کے ہاتھوں میں تھی۔ میری زندگی اور ماحول خاصے مختلف تھے اور میں نے بلا سوچے سمجھے باتھی کی زندگی کو اپنے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔

بارش کے باوجود اس شام مینکا آ گئی۔ اس نے بیل گاڑی سے اترتے ہوئے اس کا دروازہ زور سے بند کیا۔ غالباً وہ گاڑی بان سے ناراض تھی؟

''جامس، بیل گاڑی ذرا اور دور کھڑی کرنا۔ پچھلی مرتبہ جب تم نے اسے یہاں کھڑا کیا تھا تو بیل کیلے کے کچھ پتے کھا گیا تھا۔'' اس نے قدرے ترشی سے کہا۔

ہوا کی وجہ سے بارش بیل گاڑی کی طرف آ رہی تھی اور میں قطروں کو اس کے پردوں سے ٹکراتے ہوئے سن سکتا تھا۔ جامس نے باہر بارش میں نکلے بغیر بیل کو ہلانے کی کوشش کی لیکن اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ تب تک بارش میں کھڑا کیلے کے پتوں پر منہ مارتا رہا جب تک جامس نیچے نہیں اترا اور اسے مارتا ہوا ایک طرف نہیں لے گیا۔

گھٹاٹوپ تاریکی چھا رہی تھی اور آسمان کڑک رہا تھا۔ مینکا بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پا رہی تھی اور اس کی شکل سے ایسا لگتا تھا جیسے ابھی پھٹ پڑے گی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ باتھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ مینکا اکثر میرے گھر غصے میں ہی آتی تھی لیکن آج وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ عموماً جب وہ دیکھتی کہ باتھی گھر پر نہیں ہے تو اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا لیکن اس شام اس کے قہر میں کوئی کمی نہ آئی۔

''میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ اس جنگلی لڑکی کو سکول بھیجنے پر اپنے پیسے مت ضائع کرو؟''

''دیدی، کمرے میں آ جاؤ۔''

شک کے ساتھ چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد وہ میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی۔ ابھی رات نہیں ہوئی تھی لیکن کمرہ پہلے ہی تاریک تھا۔ میں نے لیمپ جلایا۔ مینکا کا چہرا اتنا پھولا ہوا اور سرخ تھا کہ یوں لگتا کہ چھونے سے پھٹ جائے گا۔

''یہ لو وہ عشقیہ خط جو تمہاری بیٹی نے لکھا ہے!'' اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے خط کو میری طرف یوں بڑھا دیا جیسے کوئی باسی مچھلی پکڑا رہی ہو۔ ''اسے چھونے سے بھی مجھے تکلیف ہوتی ہے!''

جس طرح اس نے ''تمہاری بیٹی'' کہا اس سے درحقیقت مجھے کوئی حیرت یا پریشانی نہ ہوئی۔ جب وہ ناراض نہیں بھی ہوتی تھی تب بھی لوگوں سے اسی لہجے میں بات کرتی تھی۔

جب میں خط پڑھ رہا تھا تو وہ حقارت سے ہنسی۔ میں نے خط پڑھ لیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں غصے سے زیادہ شرمندگی اور حسد محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوا

جیسے میں زمین میں دھنس رہا ہوں۔

''میں یہاں اس لیے آئی تھی کہ اس کے زور زور سے تھپڑ لگاؤں اور گھر سے باہر پھینک دوں۔'' وہ چنگھاڑی۔ اس کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے وہ شعلے برسا رہی ہوں۔ ''میں نے نہیں کہا تھا کہ وہ کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ جائے گی؟''

مجھے اب پتا چلا کہ جب میں نے باتھی سے پوچھا تھا: ''کیا تم نے اس سے پہلے بھی شعر لکھے ہیں؟'' تو وہ اتنا چونک کیوں گئی تھی۔ جب مینکا نے کہا تھا: ''وہ کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ جائے گی۔'' تو میں اندر ہی اندر اس پر ہنسا تھا۔ کیا اس نے ایسا صرف نفرت کی وجہ سے کہا تھا یا اس نے کسی طرح مستقبل کو بھانپ لیا تھا؟

انسانوں پر میرا بڑھتا ہوا اعتماد تباہ ہوگیا۔ خط پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے کچھ سب سے عزیز خیالات کو ترک کرنا پڑے گا۔ میں نے ایک سراب سے دھوکا کھایا تھا۔ مینکا کنجوس اور سازشی تھی لیکن اسے اپنے خاندان سے بہت محبت تھی۔ میں جانتا تھا کہ خاندان سے متعلق کسی بھی بات کو وہ دل پر لگالے گی۔ ایک طرح سے اس نے اماں کو پرانا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا لیکن اسے ابھی تک بڑی چاہت سے اماں کے متعلق باتیں کرنے کی عادت تھی۔

جب میں نے اپنے لیے گھر لیا تو مجھے اماں کا سوچنا اور انہیں اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا چاہیے تھا۔ میں نے ان سے پوچھا تھا لیکن انہوں نے اس گاؤں میں، جہاں مینکا رہتی ہے، رہنے سے انکار کردیا تھا۔ بہر حال میں نے صرف اسی وجہ سے انہیں اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ان کے متعلق سوچتا بھی نہیں تھا۔ باتھی کے پوری طرح جوان ہونے کے بعد تو اماں نے میرے گھر میں منتقل ہونے سے بالکل ہی انکار کر دیا ہوتا۔ باتھی کے جوان ہونے کے بعد سے میری اماں کو نظر انداز کرنے کی وجہ محض غفلت شعاری نہیں تھی، ذاتی مفاد کا بھی اس سے بہت گہرا تعلق تھا۔

''جو ہو چکا ہے اس پر بحث کرنا بیکار ہے۔'' میں نے اس کی نکتہ چینی ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔ ''ہمیں سکون سے سوچنا چاہیے کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''سب سے پہلا کام تو اس قابل نفرت چیز کو گھر سے باہر پھینکنا ہے۔ اس کے

بعد ہی ہم کوئی منصوبہ بنا سکتے ہیں۔''

وہ ابھی تک سخت ناراض تھی۔ غالباً وہ باتھی کے والدین کے متعلق مجھ سے زیادہ جانتی تھی۔

''میں نے تقریباً نو برس تک اس کی پرورش کی ہے اور اس بات کا بندوبست کیا ہے کہ وہ سکول میں کچھ سیکھے۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔

''اروندا، ناراض مت ہو۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم واقعی بہت سادہ لوح ہو،نہیں سادہ لوح بھی نہیں، تم ایک ایسے انسان ہو جسے یہ نہیں معلوم کہ مستقبل کی منصوبہ بندی کیسے کرنی ہے۔تم شاید نہیں جانتے کہ جب آٹھ برس قبل میں نے کہا تھا کہ باتھی کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ جائے گی تو میرے ذہن میں ایک اور چیز بھی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ کہیں تم کسی اور قسم کی مصیبت میں تو گرفتار نہیں ہو جاؤ گے، حالانکہ تم اتنی جانفشانی سے اس کی پرورش کر رہے ہو۔'' اس نے شرارت سے میری طرف دیکھا۔

''تو تم سمجھتی ہو کہ میں بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہوں!''

''نہیں۔'' اس نے بے صبری سے جواب دیا۔ ''لیکن تم جیسا تن تنہا رہنے والا انسان آسانی سے اس قسم کی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا ہے۔''

''تم سمجھتی ہو کہ میں یہاں ریاکاری کی زندگی بسر کر رہا ہوں؟''

''نہیں اروندا، میں نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ میں نے صرف بھانپ لیا تھا کہ تم بڑی آسانی سے مشکلات میں گھر سکتے ہو۔ گاؤں میں لوگ......''

وہ یہاں رک گئی لیکن میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ میں نے ان مسائل اور پریشانیوں کے متعلق زیادہ نہیں سوچا تھا جن کا سامنا آدمی کو سماجی رسم و رواج کو نظر انداز کر کے کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کولاسوریا کے حقیقی کردار پر اس کے لیے دیہاتیوں کے تخلیق کردہ ایک کردار کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے کولاسوریا کی اس شبیہہ کو قبول کر لیا تھا لیکن پھر اس کے ساتھ قریبی تعلق کی وجہ سے مجھے اس کی حقیقی شخصیت کا پتا چل گیا تھا۔

ہم نے اندر آتے ہوئے دروازہ بند کر دیا تھا چنانچہ جوں جوں لیمپ کی روشنی بڑھتی گئی کمرہ گھٹا گھٹا محسوس ہونے لگا۔ میں نے کھڑکی کھول دی اور لیمپ کی لو کو تھوڑا سا ہلکا

کر دیا۔ ماحول تھوڑا سا کم بھاری ہو گیا۔

''میں نے تمھیں تمہاری بیٹی کے متعلق وہ سب کچھ نہیں بتایا تھا جو میں جانتی ہوں کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس سے تمھیں بہت تکلیف پہنچے گی۔ میں تمھیں صرف اس خط کے متعلق بتانا چاہتی تھی۔''

''جو کچھ تم جانتی ہو مجھے کھل کر بتاؤ۔ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے ہر چیز کا علم ہونا چاہیے۔ تم جو بھی کہو گی میں ناراض نہیں ہوں گا۔''

''میں تمہاری ناراضگی سے نہیں ڈرتی۔'' مینکا نے ترشی سے کہا۔ ''میں صرف تمھیں زیادہ تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔ جس آدمی کو یہ خط لکھا گیا ہے وہ رات کے وقت کم از کم سات یا آٹھ مرتبہ اس ویشیا کی کھڑکی پر آ چکا ہے۔ ظاہر ہے صرف باتیں کرنے کے لیے تو نہیں آتا ہوگا! یہ مت پوچھنا کہ مجھے یہ سب کیسے پتا چلا۔''

مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی کہ مینکا کو یہ سب معلوم ہے۔ وہ سازشیں اور منصوبہ بندی کرنے میں بہت ماہر تھی۔ اس نے باتھی کا خط کیسے حاصل کیا؟ وہ اتنی چالاک تھی کہ خود اس آدمی کو بہلا پھسلا کر اس سے یہ خط لے سکتی تھی۔

''وہ آدمی کون ہے؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ ہوں ایک ڈرائیور ہے۔''

میں نے بھانپ لیا کہ اس نے خط کسی سے چوری کروایا ہے۔

''بہتر ہوگا کہ پہلے ہم اس آدمی کا پتا لگا لیں۔''

''ہم اس بارے میں پریشان کیوں ہوں؟ بس اس عورت کو گھر سے باہر پھینکو۔ کیا تمھیں نظر نہیں آتا کہ یہ کتنا کراہت آمیز خط ہے؟ اس نے ایسی زبان کیسے سیکھی؟ صرف ایک اوباش لڑکی ہی رات کے وقت کسی جوان آدمی کو اپنی کھڑکی پر بلا سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ تم نے اس کی پرورش کی لیکن یہ لوگ اپنی پیدائشی خصلت نہیں بدل سکتے۔''

میں نے خط دوبارہ پڑھا۔ اس نے مجھے بہت افسردہ اور متنفر کر دیا۔ خط جنسی جذبات سے بھرپور تھا جن کا اظہار احمقانہ ترین الفاظ میں کیا گیا تھا۔ ہر عشقیہ خط کی وجہ ایسی

ہی رومانوی سرمستی ہوتی ہے، ایک ایسا احساس جس پر لکھنے والے کے جذبات اور خیالات کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ باتھی کے خط سے اس کے بیہودہ دماغ کا پتا چلتا تھا جس میں برائے نام ذہانت تھی اور جو نظم و ضبط سے بالکل عاری تھا۔ مجھے یہ سوچ کر شرمندگی ہوئی کہ میں نے باتھی کی وجہ سے اتنی مصیبتوں کا سامنا کیا اور اس کے بعد بھی اس کا کردار اتنا غیر مہذب اور ناپختہ ہے۔

''اگر تم اسے اس کی ماں کے ساتھ باورچی خانے میں سلاتے تو تمہیں اس مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔'' مینکا نے کہا۔

''لیکن اندر والے کمرے میں اس کی ماں اس کے ساتھ ہی سوتی ہے۔''

''تم نے ان کو سونے کا سب سے اچھا کمرہ دیا اور آپ برآمدے سے اس طرف والے کمرے میں رہنے لگے!''

''میں اس کے اندر کیسے سو سکتا تھا؟''

''تو تم مانتے ہو کہ تم جذبات سے بالاتر نہیں ہو؟''

''میں نے کبھی نہیں کہا کہ میں جذبات سے بالا تر ہوں۔ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔'' میں نے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔''میں نے باتھی پر رحم کھا کر اسے سکول بھیجا تھا۔'' میں نے ماتمی انداز میں کہا۔

میرا خیال ہے کہ اس نے سوچا کہ اس وقت وہ مجھے مزید تکلیف نہ پہنچائے کیونکہ اس نے کہا:

''میں جانتی ہوں۔ لیکن تم بھول گئے تھے کہ تمہاری بیٹی ایک دن بڑی بھی ہوگی۔ تم یہ بھی بھول گئے کہ تم کنوارے ہو۔ تم ہمیشہ ماضی میں رہے اور مستقبل کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔''

اب تک اگر میں اپنے کردار کے کم از کم کچھ پہلوؤں پر فخر نہیں کرتا تھا تو ان کی توثیق ضرور کرتا تھا۔ اب وہ شکستہ عزت نفس بھی صابن کے بلبلے کی طرح پھٹ گئی جیسے کسی بچے نے سوئی چبھو دی ہو۔

جب مینکا چلی گئی تو میں نے ایک مرتبہ پھر ماضی کے متعلق سوچا۔ مجھے کوئی پچھتاوا

نہیں تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ رشتے داروں، دوستوں اور عام لوگوں نے خواہ کچھ بھی کیوں نہ کہا ہو میں نے اپنے فیصلے ہمیشہ سکون اور اپنے مزاج کے مطابق کیے تھے۔ میں اماں کو مینکا سے جھگڑنے اور گھر چھوڑنے سے روکنے کے کیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بلاشبہ میں اماں سے ملاقات کرنے کے سلسلے میں خاصا لاپرواہ تھا لیکن جب سے مجھے نوکری ملی تھی میں ہر مہینے انہیں ڈھائی سو روپے بھیجتا رہا تھا۔ میں اکثر ان سے پوچھتا تھا کہ انہیں اور پیسے تو نہیں چاہئیں لیکن ان کا جواب ہمیشہ نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے مینکا کو معاف کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ''میں زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہوں گی۔ دو یا تین برس میں میرا خاتمہ ہو جائے گا۔'' انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ کہا۔ وہ وقت کے ساتھ بوڑھی ہو رہی تھیں اگرچہ وہ ذرا بھی کمزور نظر نہیں آتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ مرنے کی باتیں اتنی آسانی سے اس لیے کرتی تھیں کیونکہ انہوں نے خود کو ہم سے علیحدہ کر لیا تھا۔ انہیں یاد تھا کہ اپنی بیماری کے دوران ابا کس طرح خود اپنے لیے اور اپنے گرد موجود لوگوں کے لیے بوجھ بن گئے تھے۔ جس طرح کی ان کی عادت تھی انہیں ایک ہفتے کے لیے بھی بستر پر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ وہ اس طرح زندہ رہتی تھیں جیسے کسی ہنگامے کے بغیر مرنا پسند کریں گی، غالباً دو یا تین روز کی بیماری لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میں باتھی کی دیکھ بھال اور محبت کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ میں نے اس کے مستقبل کے متعلق ذرا بھی نہیں سوچا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں نے اسے سکول بھیج کر اور اپنی ملازمہ رکھ کر غلطی کی تھی۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ میں جب تک زندہ ہوں باتھی میری دیکھ بھال کرے گی اور میری خوشی اور غم بانٹنے کے لیے میرے پاس ہوگی۔ مجھ جیسے درمیانی عمر کے آدمی کے دماغ میں ایسا مکروہ خیال کیسے آ گیا تھا؟ اب باتھی کے متعلق میرے جذباتی خیالات غائب ہو گئے اور ان کی جگہ حسد اور غصے نے لے لی۔

پندرھواں باب

اب میں کیا کروں؟ مجھے باتھی اور اس کی ماں دونوں کو گھر سے باہر پھینک دینا چاہیے۔ کم از کم باتھی سے تو نجات حاصل کر لینی چاہیے۔ اور اگر اس سے بھی کام نہ بنے تو پھر مجھے اس کی شادی اس نوجوان سے ہی کر دینی چاہیے جس سے وہ محبت کرتی ہے۔

لیکن میرے اندر ان میں سے کوئی بھی چیز کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ آٹھ برس تک اس کی پرورش کرنے کے بعد اب اسے نکال دینا ایک گھٹیا حرکت ہوتی۔ اور اس کی ماں، جو اب اتنے عرصے سے سارے گھر کا انتظام سنبھالے ہوئے تھی، میں اسے بھی کس طرح چلتا کر سکتا تھا؟ اور پھر باتھی کو کسی بدمعاش ڈرائیور کے حوالے کیسے کیا جا سکتا تھا؟

جس زندگی کا میں اتنا عادی ہو چکا تھا میں اس میں کسی قسم کی بھی تبدیلی سے خوف زدہ تھا اور میں یہ سوچ کر بھی پریشان ہو جاتا تھا کہ باتھی مجھے جلد ہی چھوڑ جائے گی۔

میں اپنی گزشتہ زندگی میں شاید ہی اپنی حرکتوں کے متعلق کبھی سوچتا تھا۔ جب یہ ضروری ہوتا کہ کوئی لائحہ عمل اختیار کیا جائے تو مجھے کچھ نہ سوجھتا۔ جب کوئی صورت حال میرے ذہن پر دباؤ ڈالتی تو منطقی استدلال ساتھ چھوڑ جاتا اور میں بے مقصد طور پر عمل کرنا شروع کر دیتا۔

کولا سوریا میری کمزوری سے واقف تھا۔ اس کے گھر کا سارا کام ایک ادھیڑ عمر آدمی کرتا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کام کاج کے لیے ایک لڑکا رکھا ہوا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی کولا سوریا سے بھی زیادہ چیزوں سے لاتعلق نظر آتا تھا۔

''میں نے چار دوسرے آدمیوں کو آزمانے کے بعد اسے رکھا ہے۔'' کولا سوریا نے مجھے بتایا تھا۔''دوسرے چاروں سے جان چھڑانا اتنا ہی آسان تھا جتنا اپنی جیکٹ اتارنا۔''

کولاسوریا ایسا آدمی نہیں تھا کہ ملازم جو بھی کھانا اس کے سامنے رکھ دیتا کھا لیتا۔ ملازم کو وہ کھانا پکانا پڑتا تھا جو کولا سوریا کھانا چاہتا تھا۔ اس کی عادتیں اتنی پکی نہیں تھیں کہ وہ خود کو ملازموں کی تبدیلی کے ساتھ نہ ڈھال سکتا۔ عورتیں مردوں کے اندر ایسی عادتیں پیدا کر سکتی ہیں۔ ایک عورت جسے کسی اکیلے آدمی کے گھر میں نوکری مل جائے ایسے طریقے تلاش کرتی ہے کہ وہ عمر بھر وہی نوکری کر سکے۔

''کوئی عورت جو کسی اکیلے آدمی کا گھر سنبھالتی ہو شاذ و نادر ہی ایسی جگہ چھوڑتی ہے۔'' کولاسوریا نے کہا۔''ایسی عورتیں آدمی کو کسی نہ کسی کھانے کا عادی بنا دیتی ہیں۔ ایک آدمی نے اپنی باورچن کی بنائی ہوئی ناریل کی کھیر کی اتنی عادت ڈال لی کہ وہ اپنی باقی زندگی اس سے چھٹکارہ نہ حاصل کر سکا۔

کولا سوریا نے تجربے سے، جو کچھ اس نے خود دیکھا اور سنا تھا، سیکھا تھا۔ وہ میری کمزوریاں دوسروں سے بہتر سمجھتا تھا۔ میں تو باتھی کی دیکھ بھال اور اس کی ماں کے کھانوں کا عادی ہو کر بہت خوش ہوا تھا۔

''پوسٹ ماسٹر، تم جانتے تھے کہ میں ایک احمقانہ حرکت کر رہا ہوں پھر بھی تم نے کچھ نہ کہا۔'' میں تھوڑا سا ناراض تھا۔

''میں نے تجربے سے سیکھا۔ ایک مرتبہ اپنا سبق سیکھنے کے بعد میرے لیے ان عادتوں سے چھٹکارہ پانا آسان ہوگیا جو پڑ رہی تھیں۔'' اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔

''اروندا، میرا خیال تھا کہ جوں جوں تمہیں زندگی کا تجربہ ہوتا جائے گا تم بھی اپنی عادتوں سے چھٹکارا پانا سیکھ لو گے۔ اگر میں نے تمہارے پوری طرح تجربہ کار ہونے سے قبل تمہیں کچھ بتانے کی کوشش کی ہوتی تو تم نے اسے تسلیم نہ کیا ہوتا۔ جب تک میں نے خود اپنے تجربے سے نہ سیکھ لیا میں اپنے دوستوں اور رشتے داروں کی کوئی بات تسلیم نہیں کرتا

تھا۔ اب باتھی نے تمہیں اس الجھن میں پھنسا دیا ہے، لیکن میں جانتا تھا کہ اگر اس سے پہلے میں اس کے یا اس کی ماں کے متعلق تمہیں کچھ بتاتا تو تم تسلیم نہ کرتے۔''

مجھے احساس ہوا کہ کولاسوریا کسی بھی طرح ایک ایسا شخص نہیں جس کی لاتعلقی کی وجہ سے زندگی پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہو۔ اس نے اپنی زندگی کو ویسی شکل دے دی تھی جیسی وہ چاہتا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ وہ صبح و شام دیہات میں آوارہ گردی کسی احمقانہ خبط کی وجہ سے کرتا ہے۔ لیکن یہ ایک طرح کی رسم تھی جس کا تعلق اس بات سے تھا کہ وہ کسی انسان، رواج، کھانے یا مشروب کا غلام نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ دیہات میں اپنی ذہنی حالت بہتر بنانے اور کھلی فضا سے لطف اندوز ہونے کے لیے گھومتا پھرتا تھا، اس لیے نہیں کہ وہ ہر اس چیز کو گھورے جس پر اس کی نظر پڑ جائے۔

اسے پتا تھا کہ کون سی زمین کس کسان کی ملکیت ہے حتیٰ کہ اسے ان میں اگے ہوئے بڑے ناریل کے پیڑوں کی تعداد بھی معلوم تھی۔ وہ جانتا تھا کہ موسموں کے ساتھ درخت کس طرح بدل جاتے ہیں اور پیش گوئی کر سکتا تھا کہ ندیاں کب سوکھ جائیں گی۔ وہ نہ صرف مہینے بلکہ ہفتے اور دن تک کا صحیح حساب بتا دیتا۔ وہ یہ سب کچھ کسی عجیب وغریب جبلت کی وجہ سے نہیں بلکہ کئی برس تک گاؤں کے ہمارے حصے میں ہر طرف گھومنے پھرنے، مشاہدہ کرنے اور ہر چیز کو جانچنے کی وجہ سے جانتا تھا۔

''میں ہفتے میں چار یا پانچ مرتبہ اور بعض اوقات روزانہ کوک گالا کے نزدیک ایک جگہ پر جاتا ہوں اور وہاں چٹان کا گہرا مشاہدہ کرتا ہوں۔'' اس نے مجھے بتایا۔

''کوک گالا کیا ہے؟''

''کیا تمہیں کوک گالا کا نہیں پتا؟'' وہ حیران ہو گیا۔ ''کوک گالا گاؤں کی پرلی والی طرف کھیتوں سے آگے والی اس بڑی پہاڑی کا نام ہے۔ اردگرد ہر جگہ سے سارس اس چٹان پر بسیرا کرنے آتے ہیں۔ پچھلے چند مہینوں سے میں وہاں آنے والے پہلے سارس کا انتظار کرتا ہوں اور اس کے آنے کا وقت لکھ لیتا ہوں۔ اس وقت میں ہر روز چند منٹ کا فرق پڑ جاتا ہے۔ ان کے آنے کے وقت سورج کے غروب ہونے کے وقت کے مطابق

بدلتا ہے۔ جونہی رات ہونے لگتی ہے ایک یا دو سارس چٹان پر اترتے ہیں اور یوں ادھر ادھر پھرتے ہیں جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ یقیناً ان جگہوں کو تلاش کر رہے ہوتے ہیں جہاں رہنے کے وہ عادی ہوتے ہیں۔ چٹان پرندوں سے بھر جاتی ہے جو گھوم پھر کر اپنی آرام گاہیں تلاش کرنے اور ایک دوسرے سے بھڑنے میں مشغول رہتے ہیں، اور فضا بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنبھنانے لگتی ہے۔ بعض اوقات اس افراتفری میں کچھ پرندوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں اوراوپر اڑ جاتے ہیں اور دوبارہ چٹان پر بیٹھنے سے پہلے اس کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد آہستہ آہستہ چٹان تاریکی میں گم ہو جاتی ہے۔ پھر میں گھر لوٹ آتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ دن چڑھنے تک چٹان پر پرندوں کی یہ ہلچل جاری رہتی ہے۔''

لوگ سمجھتے تھے کہ پوسٹ ماسٹر بلا مقصد آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن اب مجھے پتا چلا کہ اسے تو مویشیوں کے ان ناموں کا بھی علم ہے جن سے ان کے مالک انہیں پکارتے ہیں اور ان پر جو ملکیتی نشانیاں لگی ہیں وہ ان سے بھی آگاہ ہے۔ میں بھینس کے متعلق اس کی معلومات جاننے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔

''بھینس ایک عقلمند اور واجب التعظیم جانور ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ بوڑھے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ کسی تارک الدنیا جتنی بردبار ہوتی ہے اور شاذ ونادر ہی غصے میں آتی ہے۔ اس کی شکل اور عادات آپ کو کسی پروقار بوڑھے شخص کی یاد دلاتے ہیں۔ کسانوں سے سدھائے جانے اور ہزاروں برس تک کھیتوں میں استعمال ہونے کے بعد اس میں غالباً کچھ ایسی کھری خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں جو پرانے وقتوں کے لوگوں میں ہوتی تھیں۔''

اس کا خیال تھا کہ بھینس کے پہلوؤں اور سر کو تھپتھپانا یا اسے گھاس کھلانا اتنا ہی خوش کن ہوتا ہے جتنا سنجیدہ بوڑھے دیہاتیوں کی صحبت میں ہونا۔ حتیٰ کہ وہ کسی کے ''بھینس'' کہنے پر ناراض ہونے کو بھی حماقت سمجھتا تھا۔

پہلے تو میں سمجھا کہ کولا سوریا بھینس کا موازنہ ہمارے گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے کرکے انسانوں کی تحقیر کرنا چاہتا ہے، لیکن میرے اگلے سوالوں کے جوابات نے میرے

اس شک کو دور کر دیا۔

ایک دفعہ اس نے اپنی چھڑی ایک گوہ کے بل میں گھسیڑی۔ جب وہ گوہ ہراساں ہو کر باہر نکلی تو وہ بہت محظوظ ہوا۔ ''ایک دن میں نے اپنی چھڑی ایک بل میں ڈالی تو ایک سانپ نے سر باہر نکال لیا۔ میں بھاگ کھڑا ہوا اور وہ سر بڑا ہوتا ہوا کالے ناگ کے پھن میں بدل گیا جو کھجور کے پتے کے پنکھے جتنا بڑا تھا۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''میرا خیال ہے اس کے بعد تم نے سانپ کے بل میں چھڑی گھسیڑنا بند کر دی ہوگی۔''

''نہیں، میں نے ایسا نہیں کیا۔''

اگر چہ میں کولاسوریا کو چاہنے لگا تھا لیکن مجھے اس کے ماضی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ جو تفصیلات اس نے مجھے بتائیں ان سے میرے اپنے تجربے میں اضافہ ہوا۔

سولھواں باب

باتھی جس نوجوان سے محبت کرتی تھی اس کا قد کاٹھ کسی پہلوان اور چہرہ کسی تارک الدنیا جیسا تھا۔ اس کی پتلی قمیض میں سے اس کے مضبوط پٹھے نظر آتے تھے۔

میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ باتھی سے اس کی جان پہچان تقریباً دو برس پہلے ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ باتھی سے اس لیے ملتا ہے کہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ شرمیلے پن سے مسکرایا۔ اس کی پانچ بہنیں تھیں اور اس کا باپ چار برس قبل فوت ہو چکا تھا۔

''تم شادی کیسے کر سکتے ہو جبکہ تمہیں پانچ غیر شادی شدہ بہنوں کی دیکھ بھال کرنی ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں نے ابھی شادی کے متعلق نہیں سوچا۔'' جینا داس نے جواب دیا۔ جب اس نے وہ بال ہموار کرنے کی کوشش کی جو اس کے سر کے دونوں طرف چپک گئے تھے تو میں نے دیکھا کہ اس نے ایک بازو میں سونے کا کڑا پہن رکھا ہے۔

''تو پھر کسی جوان لڑکی سے محبت کیوں کرتے ہو؟''

اس نے نیچے دیکھا اور اپنا سر کھجایا۔

''کیا تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''لیکن تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے؟''

''میں بعد میں اس سے شادی کرلوں گا۔''

''تو ابھی تم صرف دل لگی کر رہے ہو!''

جینا داس تیئس برس کا نوجوان تھا۔ گو وہ برا لڑکا نہیں تھا لیکن باتھی ہی کی طرح خاصا نابالغ تھا۔ اس نے کوشش کیے بغیر اس طریقے سے برتاؤ کرنے کی عادت ڈال لی تھی جو عورتوں کو متوجہ کر سکے۔ اس کی خوبصورت آنکھیں بھی اس سلسلے میں اس کی مدد گار تھیں۔ وہ بظاہر اس قسم کا انسان نظر آتا تھا جو اگر زیادہ دیر کنوارا رہے تو شدت شہوت سے خود کو تباہ کر لیتا ہے۔

وہ بطور ڈرائیور تین سو روپے ماہانہ کماتا تھا۔ جہاں وہ کام کرتا تھا وہاں اسے کھانا مفت دیا جاتا تھا لہٰذا اس کے تین سو روپے اس کی تمام ضرورتوں کے لیے کافی ہوتے۔ لیکن اگر اس کی بیوی ہوتی تو اس کے لیے مفت کھانوں سے کام نہ چلتا۔ اگر میں اسے باتھی سے شادی کرنے پر مجبور کر بھی دیتا تو وہ دونوں مشکلات میں گرفتار ہو جاتے۔ پھر بھی باتھی کو گھر بٹھائے رکھنا مناسب نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ بعد ازاں میں خود کو کبھی بھی معاف نہ کر سکتا۔

''پرانی فورڈ گاڑی کی کیا قیمت ہوگی؟''میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ جس دوران اس نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میرے ذہن میں اس کے لیے کیا سزا ہے اس کی آنکھیں بہت تیزی سے ایک چیز سے دوسری پر گھوم رہی تھیں۔

''تقریباً دس ہزار روپے۔'' اس نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔''میں آپ کے ہاں کام نہیں کرنا چاہتا۔''

اس نے یقیناً یہ سوچا ہوگا کہ میں پرانی فورڈ گاڑی اس لیے خریدنا چاہتا ہوں کہ اسے اپنے پاس ملازم رکھ سکوں۔ یہ ان دونوں کو اپنے ساتھ رکھنے کا منصوبہ تھا۔

''میں تمہیں گاڑی خرید کر دوں گا۔'' میں نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔''اور میں تمہیں مزید پانچ ہزار روپے بھی دوں گا۔ تمہیں باتھی سے شادی ضرور کرنی چاہیے اور اس کے ساتھ مہذب زندگی گزارنی چاہیے۔''

اس غیر متوقع پیشکش سے وہ اتنا خوش ہوا کہ فرط مسرت سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

''فوراً جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''گھر جاؤ اور آرام سے اس کے متعلق سوچو۔ تم باتھی کے مستقبل کے ذمے دار ہو گے۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ میری ملازمہ کی بیٹی ہے؟''

''جی ہاں۔'' جینا داس نے کچھ دیر سوچا۔ ''جناب، میں رضامند ہوں۔ اگر میرے پاس گاڑی ہو تو میں اسے کرائے پر دے کر اچھے خاصے پیسے کما سکتا ہوں۔ میں نے صرف اس لیے کہا تھا کہ میں نے ابھی شادی کے متعلق نہیں سوچا کیونکہ میں بیوی کا خرچہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں صبح سے لے کر رات دس بجے تک گاڑی چلا سکتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میں نہ کوئی بے لوث خوشی محسوس کر رہا تھا اور نہ ہی چین، بلکہ ایک ناقابل بیان افسردگی میرے اوپر طاری ہو رہی تھی۔ مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال میں کیا کروں۔

اس تمام عرصے کے دوران باتھی اپنے کمرے میں ہی رہی۔ اب میں نے اسے باہر بلایا۔ اس کی آنکھوں میں نظر آنے والے گستاخانہ ضدی پن نے مجھے مزید افسردہ کر دیا۔ مجھ پر یہ حقیقت ایک مرتبہ پھر آشکار ہوئی کہ مینکا دنیا اور لوگوں کے متعلق مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔

''کیا تم نے کبھی اس ڈرائیور کو خط لکھا ہے جو ابھی یہاں آیا تھا؟'' میں نے قدرے مشتعل ہو کر پوچھا۔

''نہیں۔''

''کیا اس نے تمہیں کبھی خط لکھا ہے؟''

''نہیں۔''

اس کا دوسرا جواب جھوٹ نہیں تھا۔ باتھی کو خط لکھنے کی بجائے جینا داس اس سے رات کو اور بعض اوقات سہ پہر کو بھی ملتا رہتا تھا۔ میرا نہیں خیال کہ باتھی کی ماں اس صورت حال سے بے خبر تھی۔ جینا داس اتنا پڑھا لکھا نہیں تھا کہ شعر لکھتا۔ باتھی کے شعر پڑھنے کے بعد اس نے یقیناً محسوس کیا ہو گا کہ اسے خط لکھنے سے صرف اس کی تعلیمی کمی کا پردہ چاک ہو گا۔

"کیا وہ آدمی تم سے ملتا رہا ہے؟"

باتھی نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس کی آنکھوں میں موجود ضدی پن میں اضافہ ہوگیا۔ اب وہ بغیر کسی ڈر یا پشیمانی کے جھوٹ بول رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ مینکا نے کہا تھا کہ مجھے باتھی اور اس کی ماں کو گھر سے نکال دینا چاہیے۔ میں نے جینا داس کو لکھا ہوا اس کا خط اسے صرف اس لیے نہیں دکھایا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اسے بھی پہچاننے سے انکار کر دے گی۔ اگر اسے عزت نفس کا خیال کیے بغیر جھوٹ ہی بولنا تھا تو اسے مزید جھوٹ بولنے پر مجبور کرنے کا کیا فائدہ؟

میں اس پر غصے گرجا: "اپنے کمرے میں جاؤ۔"

جیسے ہی وہ جانے کے لیے مڑی اس نے سرکشی سے مجھے دیکھا۔ میں برآمدے میں گیا اور چھت سے لٹکے ہوئے لیمپ کی لو کو اونچا کر دیا۔ گوناوتی جو باہر باغ میں سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھی اندر گئی۔ باتھی نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ تو اسے اماں کہنا بھی پسند نہیں کرتی تھی اور اس سے کسی قسم کی ہمدردی یا مدد کی توقع نہیں رکھتی تھی۔

لیمپ کی روشنی برآمدے کے دو ستونوں میں سے ہوتی ہوئی باغ تک پہنچ رہی تھی۔ ستونوں کے سائے بھی باغ میں دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ اس سے آگے گہری تاریکی نے زمین اور آسمان کو ایک کر دیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف ناریل کے درختوں کے نیچے موجود جھاڑیاں تاریکی میں چھپی ہوئی تھیں۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے ناریل کے درختوں کے مہلک سناٹے نے میری افسردگی میں اضافہ کر دیا۔

"کیا تم اس ڈرائیور کو جانتی ہو جس سے میں باتیں کر رہا تھا؟" جیسے ہی گوناوتی اندر آئی میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں جناب۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ وہ لیمپ کے نیچے رک گئی۔

میں واپس برآمدے میں چلا گیا۔

"کیا وہ پہلے یہاں کبھی نہیں آیا؟"

"میں نے دیکھا نہیں کہ وہ کون تھا۔"

''اس نے مجھے بتایا کہ وہ تمہیں جانتا ہے۔''

''ہاں، میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں اسے جانتی ہوں۔''

وہ باتھی سے بھی زیادہ بے حیائی سے جھوٹ بول سکتی تھی۔

''میں باتھی کی شادی جینا داس سے کرنے کا سوچ رہا ہوں۔''

''اوہ! شکریہ جناب!'' اس نے واضح طور پر خوش نظر آتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

اب میں بیزار سے زیادہ ناراض تھا۔ میں نے ان دونوں کو گھر سے نکالنے کے متعلق سوچا۔

''باتھی نے جینا داس کو خط لکھے ہیں اور وہ کئی دفعہ اس سے ملنے یہاں آچکا ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے کہا۔ اس کے لہجے سے اس کی پریشانی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے دوبارہ میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ لیکن میرے چہرے پر ایک مرگ آسا بے حسی چھائی رہی۔

''میں خطوں کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن مجھے معلوم ہے کہ جینا داس اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔''

''پھر تم نے یہ کیوں کہا کہ تم اسے نہیں جانتیں؟''

''میں نے ایسا اس لیے کہا کہ میرا خیال تھا کہ اگر آپ کو پتا چل گیا تو آپ مجھے ڈانٹیں گے۔ میرا خیال تھا کہ آپ نے اس لیے پوچھا ہے کیونکہ آپ کو پورا یقین نہیں ہے۔''

باتھی جھوٹ بولتی تھی لیکن وہ عیار نہیں تھی۔ گوناوتی اس لیے جھوٹ بولتی تھی کیونکہ وہ عیار تھی۔ اسے مجھ سے ذرہ برابر بھی ڈر نہیں لگتا تھا۔ گوناوتی جانتی تھی کہ باتھی اسے حقارت سے دیکھتی ہے لیکن وہ پھر بھی اس سے شدت سے محبت کرتی تھی۔ وہ شروع سے جانتی تھی کہ جینا داس باتھی سے باتیں کرنے رات کے وقت جالی والی کھڑکی پر آتا ہے۔ وہ

اس کے خلاف نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ باتھی سے ڈرتی تھی بلکہ یہ تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی جتنی جلدی ممکن ہو کسی سے ہو جائے۔ اس کی کچھ بالواسطہ باتوں سے مجھے احساس ہوا کہ اسے اپنی جوان بیٹی کا میرے ساتھ گھر میں رہنا پسند نہیں تھا۔

اس نے مجھے جو تفصیلات بتائیں ان سے پتا چلتا تھا کہ اس میں اپنی بیٹی جتنی ہی دماغی صلاحیت تھی۔ اس نے باتھی کی حقارت اور اسے اماں کہنے سے نفرت کرنے کو خوف یا بیوقوفی کی وجہ سے برداشت نہیں کیا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔

ایک رات باتھی جینا داس کی باتوں میں آ کر برآمدے کو جانے والے دروازے تک چلی گئی تھی۔ گوناوتی اس کے اور دروازے کے درمیان آ گئی تھی اور اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا تھا۔ کسی کم سرکش لڑکی کے لیے تو اتنا ہی کافی ہوتا لیکن باتھی مصر تھی اور اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی۔ گوناوتی اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی واپس بستر پر لے گئی تھی اور اس نے زور سے کھڑکی بند کر دی تھی۔

باتھی برآمدے کی طرف آئی۔ اس نے یقیناً یہ سوچا ہو گا کہ ہماری گفتگو ختم ہو چکی ہے۔ گوناوتی ابھی تک لیمپ کے نیچے کھڑی تھی۔ باتھی نے اس کا غضب ناک چہرہ دیکھا تو وہ رک گئی۔ لیکن کمرے میں واپس جانے کی بجائے وہ صرف ہمیں غصے سے گھورتی رہی۔

جب باتھی مسکراتی ہے تو اس کا چہرہ روشن ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھوں کے گرد جلد میں شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ جب وہ غصے میں ہوتی ہے تو اس کی آنکھیں فوراً بدل جاتی ہیں۔ وہ پھیل کر یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے اس کے سر سے باہر ابل پڑیں گی۔ وہ گہری سرخ ہو جاتی ہیں۔ یہ تقریباً ایسے ہی جیسے چھپی ہوئی بے رحمی اور خباثت ظاہر ہو رہی ہو، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہ تبدیلیاں اس بات کی غماز ہیں کہ اس کی آنکھوں سے اس کی مضبوط کردار کا سچا اظہار ہوتا ہے۔

کچھ دیر بعد باتھی واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ایک پتنگا جو لیمپ کے گرد ناچ رہا تھا اس کی گرم چمنی سے ٹکرا کر جھلس گیا اور زمین پر گر گیا۔ ہر کوئی تجربے سے سیکھتا ہے۔ پتنگے کے لیے سیکھنے کا یہ عمل ہلاکت خیز ثابت ہوا جبکہ انسان سیکھتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔

''میں اس کی شادی اپنے دفتر کے کسی کلرک کے ساتھ کرنے کے متعلق سوچ رہا

تھا۔''

میری اس بات کا بھی گوناوتی پر بظاہر کوئی اثر نہ ہوا۔ جب اس کے اپنے والدین نے اس کے لیے شوہر تلاش کیا تھا تو وہ ایک گاڑی بان کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اب وہ باتھی کے مستقبل کے بارے میں سوچے بغیر محض اپنے ذاتی تجربے کا سہارا لے رہی تھی۔ اس کے خیالات اور عقائد اس کے تجربے کے پابند تھے، اور اسے اپنے ماضی کی روشنی میں جینا داس باتھی کے لیے صحیح شوہر نظر آتا تھا۔ اگر وہ باتھی کی شادی کسی کلرک سے بھی کر دیتی تو وہ کبھی نہ کبھی تنگ آ جاتا۔ اپنے محدود تجربے کی وجہ سے وہ معاشرے میں بلند مقام حاصل کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی اسے یہ نظر آیا کہ جب میں باتھی کو سکول بھیجا تو ایک طرح سے میں اس کا باپ بن گیا۔ میرے ساتھ اس کے رویے میں ایک خاص قسم کا خوف اور شک تھا۔

میں ایک تاریک اور عجیب وغریب دنیا میں رہتا تھا جو خود میرے اپنے تخیل کی تخلیق کردہ تھی۔ باتھی نے اس دنیا میں تھوڑا سا اجالا کیا تھا۔ مجھے خوش فہمی تھی کہ وہ ایک وفادار ملازم کی طرح میری موت تک میری دیکھ بھال کرے گی۔ اب میں صرف اس وجہ سے ناراض اور ناامید تھا کہ اسے ایک نوجوان سے محبت ہو گئی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ نوجوان ایک ڈرائیور تھا۔

میں ریت پر گھر بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور میرے عمارت مکمل کرنے سے پہلے ہی ریت سرک رہی تھی۔ اگر یہ عمارت گر جاتی تو میں اس کھنڈر تلے دب جاتا اور باتھی اور اس کی ماں کو کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ کولاسوریا نے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ڈھکے چھپے الفاظ میں خبردار بھی کیا تھا۔ اس نے خود بخود یہ پیش بینی کر لی تھی۔

میں رات کا کھانا کھانے کے لیے بیٹھا لیکن تین چار لقموں سے زیادہ نہ کھا سکا۔ مجھے بھوک جیسی کوئی چیز محسوس ہو رہی تھی لیکن کھانا میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ مجھے تھکن محسوس ہو رہی تھی لیکن مجھے بھوک نہیں تھی۔ پچھلے چند برس سے میں کسی ایسے شخص کی زندگی بسر کر رہا تھا جس کی روزانہ کی آمدنی بمشکل اتنی تھی کہ وہ دن میں صرف ایک مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے۔

پھر بھی میں ایک مہینے میں اتنا کما لیتا تھا جتنا میں تین مہینوں میں خرچ کر سکتا۔ اب جب میں دفتر میں آٹھ گھنٹے گزارنے کے بعد گھر لوٹتا تو مجھے پہلے سے زیادہ تھکاوٹ میرا پیچھا نہ چھوڑتی۔ میری طاقت ختم ہو جاتی۔ میں جتنا ممکن ہوتا اتنا کھانا صرف اس لیے اپنے حلق سے نیچے اتار لیتا کیونکہ اگلے روز دفتر میں مجھے ایک اور آٹھ گھنٹے گزارنا ہوتے تھے۔

چند روز پہلے سے باتھی نے میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اسے میز پر بلانے کی کوشش کی تھی لیکن جب وہ نہ آئی تو میں نے اکیلے ہی کھانا کھا لیا۔ ''میرے لیے گرما گرم کھیر بناؤ'' میں نے گوناوتی سے کہا۔

جس طرح ایک تھکے ماندے گھوڑے کو چابک کے زور پر چند گز مزید چلوایا جا سکتا ہے اسی طرح کھیر نے میری بھوک کو کچھ بڑھا دیا۔ میں نے چند اور لقمے لیے اور پھر برآمدے میں چلا گیا۔

میں نے باغ میں ایک کوے کی کائیں کائیں سنی جو لیمپ کی روشنی سے دھوکا کھا گیا تھا۔ جب وہ اپنا مخصوص ٹھکانہ نہ تلاش کر سکا تو ہمارے ایک درخت پر آ بیٹھا۔ ستاروں کے جھرمٹ تاریکی میں ہلکے سے ٹمٹماتے ہوئے ان گنت جگنوؤں کی مانند پھیلے ہوئے تھے۔ برسوں پہلے جب میں محض ایک لڑکا تھا تو اس بیساکھ کی رات میں سروجنی سے باتیں کر رہا تھا۔ جس خوشی سے میں نے چاندنی میں نہائے ہوئے آسمان اور باغ کو دیکھا تھا وہ ناقابل بیان ہے۔ چاندنی سے منور آسمان کو دیکھ کر مجھے جنت کا خیال آ گیا تھا۔ اب میں آسمان کے متعلق ویسا محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ میں اتنا تبدیل کیسے ہو گیا؟ اس وقت سے لے کر اب تک میں نے ہمیشہ اپنی زندگی کسی کو نقصان پہنچائے بغیر گزارنے کی کوشش کی تھی۔ مینکا بظاہر اس اصول کے مطابق زندگی بسر کرتی تھی کہ زندگی ایک میدان جنگ ہے۔ اس کے لیے آسمان اور زمین کبھی نہیں بدلتے تھے۔

اس لڑکے کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد میرے متعلق باتھی کے جذبات میں اتنی تبدیلی آ گئی تھی کہ یوں ظاہر ہوتا تھا کہ اب وہ مجھے تقریباً ناپسند کرتی ہے۔ جب میں باتھی سے اس کے متعلق کوئی سوال کرتا تو وہ مجھے صرف قہر آلود نظروں سے گھورتی۔ زندگی سے متنفر ہونے سے بچنے کے لیے زندگی کو گلے لگانا پڑتا ہے۔ لیکن اسے گلے لگانے سے

پہلے اس سے جنگ بھی لڑنا پڑتی ہے۔

جس طرح کوئی چمگادڑ اپنا ٹھکانا تلاش کرتی ہے میرے ذہن نے میرے کمرے میں پناہ ڈھونڈی۔ میں نے صرف آدھا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ میری میز پر رکھا لیمپ بظاہر تاریکی کے ساتھ لڑلڑ کر تھک چکا تھا۔ میں نے زیادہ روشنی کے لیے اس کی بتی اونچی کردی۔ تھوڑی ہی دیر بعد روشنی دوبارہ کم ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ میں لیمپ میں ڈالنے کے لیے تیل لانے کی مصیبت اٹھانے کی بجائے جلدی سو جاؤں گا۔ شعلہ اپنے آخری سانس لے رہا تھا۔ وہ تین مرتبہ پھڑ پھڑایا اور پھر غائب ہوگیا۔

میرا جسم تاریکی میں ڈوب گیا اور اس کے ساتھ ایک ہوگیا لیکن میرا ذہن ابھی تک شعلے کی مانند رات سے جنگ لڑ رہا تھا۔ اب میرے اوپر ایک اور انکشاف ہوا۔ باتھی نہ ہی میری بیٹی تھی اور نہ ہی رشتے دار۔ وہ صرف میری ملازمہ کی بیٹی تھی۔ جب وہ بچی تھی تو میں اس پر رحم کھاتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی یہ ترحم لامحسوس طور پر کسی اور چیز میں تبدیل ہوتا گیا۔ جس وقت تک وہ جوان ہوئی یہ ترحم کشش میں بدل چکا تھا۔ جب مجھے پتا چلا کہ وہ جینا داس سے محبت کرتی ہے تو میرے اندر حسد نے سر ابھارا تھا۔ یہ ایک ایسا حسد تھا جو جلد ہی غصے میں تبدیل ہوگیا۔ جینا داس کے ساتھ اس کی شادی کرنا میرے نزدیک ایسے ہی تھا جیسے میں کسی ایسے ہاتھ کو چوم لوں جسے میں کاٹ دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

اگر میں اپنے اصلی جذبات کو منظر عام پر آنے دیتا تو میں جینا داس سے نجات حاصل کرکے باتھی کو اپنا حکم ماننے پر مجبور کر دیتا۔ لیکن مجھے اس بات کی اتنی فکر تھی کہ دنیا کیا کہے گی کہ میرے حقیقی جذبات کچھ اور ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ یہ کوئی اخلاقی پابندی تھی جس نے انہیں دبائے رکھا۔

باتھی کو اپنی بنانے کی مجھے کوئی آرزو نہیں تھی لیکن میری دلی خواہش تھی کہ وہ میرے ساتھ چپکی رہے اور میری دیکھ بھال کرے۔ میں اس بات سے اتنا خوفزدہ کیوں تھا کہ وہ کسی اور کی خاطر مجھے چھوڑ دے گی؟

بعض اوقات جب بیٹی اپنی محبت کسی اور کو منتقل کر دے تو والدین ناراض ہو جاتے ہیں۔ کچھ والدین ایسے جذبات پر قابو پا لیتے ہیں جبکہ باقی ایسا نہیں کرسکتے اور

حسد بھرا غصہ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن باتھی میری بیٹی نہیں تھی۔

یوں لگتا تھا کہ باتھی کی شبیہہ میرے دماغ پر نقش ہو گئی تھی۔ مینکا نے کہا تھا کہ باتھی کو اپنے ساتھ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ گاؤں کے لوگ پہلے ہی مجھے منافق سمجھتے تھے۔ مجھے غمگین نہیں بلکہ خوش ہونا چاہیے تھا کہ باتھی کو جینا داس سے محبت ہو گئی ہے۔ اگر اسے مجھ سے محبت ہو جاتی تو کیا اس سے یہ ثابت نہ ہو جاتا کہ میں اس تمام عرصے منافقت سے کام لیتا رہا تھا؟

میں نے اپنی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی لیکن میرا ذہن تب تک کام کرتا رہا جب تک میں تھک کر چور نہ ہو گیا۔ میں نے اپنے ذہن کو تمام سوچوں سے خالی کرنے اور سونے کی کوشش کی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اپنے تکیے کو پلٹتا۔ چند منٹ میں میرے سر کے نیچے تکیہ گرم ہو گیا۔ میں نے دوبارہ تکیے کو پلٹا اور کچھ آرام دہ محسوس کیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ تکیے کی وہ طرف بھی میرے نیچے جلنے لگی۔

سروجنی مجھ سے کتنی محبت کرتی تھی؟ جب اس نے مجھے پہلے پہل خط لکھے تو وہ ایک شرمیلی لڑکی تھی۔ میں جہاں چاہتا وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جاتی چاہے اس کے والدین کچھ بھی کہتے۔ اس نے مجھ سے محبت کی تھی سری داس سے نہیں۔ اس نے مجھے کبھی جذبات بھرے شعر نہیں لکھے تھے لیکن اوقات جب ہم تنہا ہوتے تو وہ اپنا گال میرے گال کے ساتھ یوں رگڑتی جیسے وہ مجھ سے یہ توقع کر رہی ہے کہ میں اسے چوم لوں گا۔ اس وقت میں اتنا شرمیلا اور ڈرپوک تھا کہ اسے چوم نہیں سکتا تھا۔ لیکن وہ اس بات پر ناراض نہیں ہوتی تھی، بس کن اکھیوں سے مجھے دیکھتی تھی اور مسکراتی تھی۔ اس نے یہ جانتے ہوئے مجھ سے محبت کی تھی کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔

جس رات وہ بھجن گانے والوں کا جلوس دیکھنے آئی تھی اس نے میرے اندر محبت کا پھول کھلا دیا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے میرا ہاتھ دبایا تھا اور اس رات (کھانا کھاتے، سوتے ہوئے) میں نے صرف اس کے متعلق سوچا تھا۔ اس روز تک، جب میں نے اس کا آخری خط پڑھا، میری تمام خوشی اس بات میں تھی کہ اپنے تصور میں اس کی شبیہہ قائم رکھوں، اس کے متعلق سوچوں اور اس کی کہی باتیں اپنے ذہن میں بار بار دہراؤں۔

سارا کی شبیہہ میرے ذہن پر طاری ہو گئی...... اس کی مسکراہٹ......میرے چہرے پر مرکوز اس کی آنکھیں......میرا ذہن پرسکون اور ہلکا پھلکا ہو گیا......میری آنکھیں نیند سے بھاری ہو گئیں۔ سارا کی شبیہہ غائب ہو گئی......تاریکی میرے ذہن پر غالب آ گئی......سری داس......سارا......وہ مسکراتے ہوئے اکٹھے برآمدے میں آتے ہیں......وہ دوستوں اور رشتے داروں سے باتیں کرتے ہیں......سارا میری طرف نہیں دیکھتی......وہ ایک کمرے میں چلے جاتے ہیں، ان کے جسم ایک دوسرے کو چھو رہے ہوتے ہیں...... وہ میری طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے......

میں ایک خواب کی دہلیز پر بیدار ہو گیا۔ کمرہ تاریک اور خاموش تھا جبکہ ہوا ٹھنڈی تھی۔ باربیٹوں کی بلند آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے باتھی کے ان خیالات سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں جو مجھ پر غالب آ رہے تھے۔ میں نے دوبارہ اپنا تکیہ پلٹا۔ میری نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہونے لگیں...... میرے اعضا بے جان ہو گئے......

میں کوؤں کی آواز سے بیدار ہوا۔

سترہواں باب

اس دن دفتر میں اپنا کام کرتے ہوئے میرا ذہن ہمیشہ سے زیادہ پر سکون تھا، تاہم مجھے بہت تھکاوٹ محسوس ہوئی۔ مجھے سونے سے بچنے کے لیے دو تین مرتبہ چائے پینا پڑی۔

میں نے ماضی کو بھلانے کی کوشش کی اور مستقبل کے متعلق ذرا بھی نہ سوچا۔ حال کے پاس میرے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے باتھی کی تمام سوچوں کو اپنے ذہن سے باہر رکھا، بالکل ویسے ہی جیسے جب اماں کے متعلق سوچنا بہت تکلیف دہ ہو گیا تھا تو میں نے ان کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ کولاسوریا کے بارے میں سوچنا ہی وہ چیز تھی جس سے مجھے خوشی ہوتی تھی۔

دفتر بند ہونے کے بعد گھر جاتے ہوئے مجھے تھکن محسوس ہوئی لیکن میں خوش تھا۔ سری داس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے ایک بیل گاڑی میں سے ہاتھ ہلایا اور چلایا: ''میں سارا کے ماں باپ سے ملنے جا رہا ہوں۔''

ارانولس مجھے راستہ دینے کے لیے رکتے ہوئے مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ میں ناریل کے پتے کی رسی اور دوسرے میں چھ ناریلوں کا گچھا اٹھا رکھا تھا۔ وہ صبح کو مزدوری پر ناریل اتارتا تھا اور رات کو ناریل چوری کرتا تھا۔ میں چوراہے تک پہنچ کر گھر جانے والی سڑک پر مڑ گیا۔ بوڑھے سیا دورس نے اپنی مچھلی کی ٹوکری زمین پر رکھی اور میرے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

''میں واپس جا رہا تھا کیونکہ وہ کہہ رہی تھیں کہ جب تک آپ گھر نہیں آجاتے وہ خریداری نہیں کرسکتیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ مچھلی رکھ لیں اور میں پیسے بعد میں لے لوں گا۔ آپ کی ملازم لڑکی اب پہلے جیسی نہیں رہی، اب وہ بہت بدل گئی ہے۔''

سیادورس کی آواز لرز رہی تھی جیسے وہ سردی سے کانپ رہا ہو۔ مچھلی کاٹتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپتے تھے۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے کہا۔ میں نے اپنی رفتار آہستہ کر دی۔

''سیادورس، تمہارے دونوں بیٹے اب اچھی تنخواہیں لیتے ہیں۔ تم آرام سے گھر بیٹھ کر کھا سکتے ہو۔'' میں نے اپنے کندھے کے اوپر سے کہا۔

''جی جناب۔ میرے بیٹے میری بہت اچھی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں گھر گھر جا کر مچھلی بیچوں۔ لیکن میں فارغ نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے سارا دن کچھ نہ کرنا مچھلی اٹھائے دیہات میں پھرنے سے مشکل لگتا ہے۔ میں ایسی زندگی کا عادی ہوں۔''

وہ یوں کانپا جیسے اسے ناقابل برداشت ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہو اور اس کی آواز پرسرار لگنے لگی۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے ناقابل بیان طور پر میرے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑنے لگی۔

میں نے اسے پیسے ادا کیے اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اپنی جیکٹ اتارنے کے بعد میں دوبارہ باہر آیا اور باتھی کو آواز دی۔ وہ خواہ کتنی بھی ناراض ہوتی، حتیٰ کہ اگر وہ روٹھ کر ایک کونے میں بھی پڑی ہوتی، اپنے لباس کے معاملے میں کبھی لاپرواہی نہ برتتی اور دن میں دو مرتبہ نہاتی اور پاؤڈر لگاتی۔

''کیا مینکا دیدی آئی تھیں؟''

''ہاں۔'' اس نے آزردگی سے جواب دیا۔

''اور کولاسوریا؟''

''وہ بھی آئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ کل دوبارہ آئیں گے۔''

''میں تمہاری شادی اپنے دفتر کے کسی کلرک کے ساتھ کرنے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ خفگی سے اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔

میں نے اس کی شادی کسی کلرک سے کرنے کے متعلق صرف یہ پتا چلنے کے بعد سوچا تھا کہ وہ جینا داس کو خط لکھتی ہے۔ یہ خیال پہلی مرتبہ اس وقت میرے ذہن میں آیا تھا جب میں اس کی ماں سے اس کے بارے میں بات کررہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ باتھی کسی کلرک سے شادی کرنا پسند کرے گی چاہے اس کی ماں کو یہ پسند نہ بھی ہو۔ جینا داس ایک گھٹیا لباس پہننے والا ڈرائیور تھا جبکہ کلرک پتلون پہنے گا اور اپنے قلم سے روزی روٹی کمائے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ کوئی بھی جوان لڑکی ایسے شخص سے شادی کرنا پسند کرے گی۔ باتھی نے اس ناراضگی اور غصے کو چھپانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی جو اس نے میری تجویز پر محسوس کیا تھا۔ غالباً اس نے سوچا تھا کہ میں اپنے ساتھ رکھنے کے لیے دھوکا دے رہا ہوں۔

''کیا تمہیں میری بات پسند نہیں آئی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے ایسے جواب دیا جیسے کسی کو ڈانٹ رہی ہو۔

''نہیں۔''

''میرا خیال تھا کہ تم اسے بہت پسند کروگی۔''

''نہیں، مجھے یہ پسند نہیں۔'' اس نے تلخی سے دہرایا۔

''اگر تم ایسا نہیں چاہتیں تو تمہاری شادی کسی کلرک سے کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے جینا داس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''ہاں۔''

باتھی اپنی ماں کی طرح ان پڑھ نہیں تھی اور پھر بھی ہر کام بالکل اس کی طرح جذبات میں آکر کرتی تھی۔

''اگر تمہیں جینا داس پسند ہے تو میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔''

اس کا پورا چہرہ اس کی خوشی کا غماز تھا۔ وہ کسی ایسے قیدی کی مانند دکھائی دینے لگی جس سے کہا گیا ہو کہ وہ آزاد ہے۔

جب تک مجھے یہ پتا نہیں چلا تھا کہ باتھی جینا داس کو خط لکھتی ہے میں نے کبھی اسے ڈانٹا نہیں تھا حتیٰ کہ اس سے غصے سے بات بھی نہیں کی تھی۔ میری غیر موجودگی میں وہ

اکیلی گھر کی مالکن ہوتی۔ پھر بھی وہ یہاں ایسے رہ رہی تھی جیسے کسی قید خانے میں ہو۔ جب آپ نے کسی طوطے کو بطور پالتو جانور پنجرے میں رکھا ہو تو آپ اس پر چاہت نچھاور کرتے ہیں اور اسے ہر طرح کی چٹ پٹی چیزیں کھلاتے ہیں۔ جب وہ آپ سے لفظ سیکھتا ہے اور آپ کی باتوں کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو آپ خوش ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ آپ سے کسی بچے کی طرح محبت کرتا ہے۔ لیکن آپ اسے ایک لمحے کے لیے بھی پنجرے سے باہر نکالیں تو وہ اڑ جاتا ہے اور جنگل میں کسی گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب سباتھی نے مجھے ابا کہنا سیکھا تو کیا وہ پنجرے میں قید کسی طوطے سے بہتر تھی؟

گوناوتی نے مجھے بتایا کہ مینکا آئی تھی اور باتھی کو اچھی خاصی باتیں سنا کر گئی ہے۔ باتھی نے اس کی ڈانٹ ڈپٹ اور تذلیل کیسے برداشت کی؟ میری تو ذرا سی ڈانٹ پر وہ روٹھ جاتی ہے۔

''جناب، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب ان کی عادت سے واقف ہیں۔ اسی لیے میں نے خاموشی سے ان کی باتیں سن لیں۔ بہرحال میں نے اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں سے جانے کا سوچ لیا ہے۔'' گوناوتی نے کہا۔

''مگر وہ تو مجھے بھی ڈانٹتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے خاموشی سے اس کی باتیں سن لیں۔''

مینکا اب پوری طرح بیگم بن چکی تھی۔ اس نے ہماری جائیداد کے پہلو میں زمین کے دو ٹکڑے خرید کر اس میں اضافہ کر لیا تھا۔ سری مل اب سترہ برس کا نوجوان تھا لیکن وہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا تھا جو مینکا کو ناپسند ہو۔ دھرم داس بھی ویسا ہی کرتا تھا جیسا مینکا چاہتی تھی۔ وہ اپنی تنخواہ اسے لا کر دیتا تھا۔ وہ اس سے پوچھے بغیر اپنا لباس بھی نہیں سلواتا تھا۔ جب اسے پیسوں کی ضرورت ہوتی تو وہ اس سے دس بیس روپے مانگ لیتا۔ جب وہ اپنے دفتر میں اس دن کا کام ختم کر لیتا تو اس کی صرف یہ خواہش ہوتی کہ واپس گھر جائے اور شام اپنے بیٹے کے ساتھ باتیں کرنے اور اس کے سکول کے کام کے متعلق دریافت کرنے میں گزارے۔

سری مل گاہے بگاہے مجھ سے ملنے آ جاتا تھا۔ وہ ایک بردبار نوجوان تھا جس کی

گفتگو سے اس کے منظّم کردار کا پتا چلتا تھا۔اس نے اپنے ایک امتحان میں پاس ہونے پر میرے تحفہ بھیجنے کا بہت پر جوش طریقے سے شکریہ ادا کیا:

''اروندا ماموں، آپ نے ایک تحفہ پر اتنے پیسے کیوں خرچ کیے؟ ان کتابوں کی قیمت کم از کم پانچ چھ سو روپے تو ہوگی۔''

''نہیں، صرف چار سو روپے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے پیسوں کا کیا کرنا ہے؟ سری مل، خوب دھیان لگا کر پڑھنا۔ اگر تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔ صرف شادی شدہ لوگوں کو پیسے بچانے کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''آپ چاہے شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں اتنے زیادہ پیسے خرچنے کی کیا ضرورت ہے؟ امی مجھے جیب خرچ کے لیے صرف ایک روپیہ دیتی ہیں۔''

''کیا ایک روپیہ تمہارے لیے کافی ہوتا ہے۔''

''بالکل۔'' سری مل نے خوش مزاجی سے کہا۔ ''میں کالج میں لڑکوں کے ساتھ نہیں پھرتا۔ اسی قسم کی چیزوں کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''کیا تم دوسرے لڑکوں کے ساتھ اس لیے نہیں پھرتے کہ تمہارے پاس پیسے نہیں ہوتے؟''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ لیکن جب آپ کے پاس پیسے ہوتے ہیں تو آپ دوسرے لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی کرنے کے متعلق سوچتے ہیں۔''

''کیا تمھیں یہ پسند نہیں ہے؟''

''زیادہ نہیں۔ میں ابو کے گھر آنے کے بعد باہر نہیں جاتا۔''

''اس مرتبہ جماعت میں تمہاری پوزیشن کیا تھی؟''

''سولھویں۔'' اس نے فوراً کہا۔

جب میں کالج میں تھا تو پوری کوشش کیا کرتا تھا کہ جماعت میں کم از کم دوم ضرور آؤں۔ ابا میری حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے کہ اول یا کم از کم دوم ضرور آؤں۔ سری مل کی پوزیشن بیسویں بھی ہوتی تو مینکا اسے نہ ڈانٹتی۔ وہ اس سے صرف تب ہی پوچھ گچھ کرتی اگر وہ کسی امتحان میں فیل ہو گیا ہوتا۔ سری مل ہر امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

''اروندا ماموں، آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟ کیا آپ شادی نہیں کرنا چاہتے؟'' سری مل نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''میں نے کبھی شادی کرنے کے متعلق نہیں سوچا۔''

سری مل نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ سے مجھے مینکا یاد آ گئی۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ دھرم داس اور منہ اور ہونٹ مینکا کے تھے۔

''میں نے امی کو کئی مرتبہ کہتے سنا ہے کہ آپ نے اس لیے شادی نہیں کی کیونکہ آپ آنٹی سروجنی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔''

''سری مل، کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو؟''

''پھر آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''کیا ہر شخص کا شادی کرنا ضروری ہے؟''

''مجھے نہیں پتا۔ کیا آپ اکیلے بور نہیں ہو جاتے؟''

''میں ہر صبح دفتر جاتا ہوں اور شام تک واپس نہیں آتا۔''

''امی کہتی ہیں کہ آپ اتنے دبلے اس لیے ہو رہے ہیں کیونکہ آپ نے شادی نہیں کی۔''

میں ہنس دیا۔ مینکا ابھی تک سمجھتی تھی کہ میں سروجنی کے لیے مرا جاتا ہوں! مینکا دولت اور جائیداد کے بارے میں خاصی دور اندیش تھی لیکن جہاں تک محبت کی بات ہے وہ اول فول بکتی تھی۔ اسے اس کا سرے سے ہی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے دھرم داس سے بخوشی شادی کی تھی کیونکہ یہ رشتہ ابا کا تجویز کردہ تھا۔ مینکا یقیناً جانتی تھی کہ میں سروجنی سے بہت محبت کیا کرتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میری حماقت کی وجہ سے سروجنی نے سری داس سے شادی کر لی تھی اور اسے یقین تھا کہ میں اس وجہ سے شادی نہیں کر رہا تھا کیونکہ جو کچھ ہوا تھا میں ابھی تک اس کے بارے میں پریشان تھا۔

میں نے کئی مرتبہ اس کے یہ خیالات بدلنے کی کوشش کی تھی۔ بعض اوقات تو یہ میری ناراضگی کا باعث بن جاتے تھے۔

''میں صرف اس لیے شادی نہیں کرتا کیونکہ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ تمہاری امی

اور میری زندگی کے تجربات بالکل مختلف ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ یہ سمجھنے کی بجائے وہ صرف بے عقلی کی باتیں کرتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ، لیکن اب آپ بوڑھے ہو رہے ہیں۔'' اس نے میرے چہرے اور سفید ہوتے ہوئے بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''اسی لیے آپ کو شادی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن کیا یہ درست نہیں کہ جب آپ جوان تھے تو آپ شادی کرنا چاہتے تھے؟''

''نہیں۔''

مینکا نے میرے متعلق جو باتیں کی تھیں اسے وہ یقیناً بہت دلچسپ معلوم ہوئی ہوں گی۔

''پھر آپ آنٹی سروجنی سے محبت کیوں کرتے تھے؟''

''مجھے اس سے محبت تھی لیکن میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔''

''تو پھر کیا آپ صرف وقت ضائع کر رہے تھے؟''

''نہیں، میں وقت ضائع نہیں کر رہا تھا۔''

میں نے سری مل کو جو جواب دیے انہوں نے اس سے زیادہ خود مجھے حیران کیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خود اپنے سوالوں کے معنی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ غالباً کوئی ایسی بات سننے کے بعد متجسس ہو گیا جو مینکا نے دھرم داس یا اور کسی شخص سے میرے متعلق کہی تھی۔ لیکن اس کے سوالوں نے ماضی، میرے اور سروجنی کے ماضی، کے متعلق میرے جذبات کو بھڑکا دیا۔ ان جذبات کی وجہ سے مجھے خوشی اور غم دونوں محسوس ہوئے۔ صرف دو یا تین روز قبل میں نے باتھی کی شادی جینا داس سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے باتھی کے سوا کسی اور کو اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

میرا ذہن کسی ویران مسافر خانے کی طرح اجاڑ ہو چکا تھا۔ میرے بھولے ہوئے کالج کے دن اور سروجنی میرے ذہن میں واپس آ گئے۔

سری مل کے جانے کے بعد میں نے اپنی الماری کا دراز کھولا اور اپنے خط باہر نکالے۔ میں نے ایک ایک کر کے ان کو پڑھا۔ ان میں سروجنی کا صرف آخری خط موجود تھا۔ اس کو پڑھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ میں نے اس کے باقی سب خط جلا دیے تھے۔ اس

نے وہ آخری خط یقیناً اس لیے لکھا تھا کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ سری داس کو پسند کرنے لگی ہے۔ وہ یقیناً خوفزدہ ہوگی کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب وہ مجھے اپنے ذہن سے نکال دے گی اور سری داس سے شادی کر لے گی۔

جلد ہی باتھی کی شادی جینا داس سے ہو جائے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائے میں اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔

اس کے اندر آنے سے پہلے لیمپ کی بتی تھوڑی سی نیچی کردی۔ میرے اندر جاری جنگ سے میرا ذہن انتشار کا شکار تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ باتھی اسے جان پائے۔ میرے ذہن میں ایسے خیالات ابھر رہے تھے جن کا اظہار باتھی یا کسی بھی اور پر کبھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ ایسے خیالات تھے جو بدروحوں کی طرح تاریکی کو روشنی پر ترجیح دیتے تھے۔

مدھم روشنی کی وجہ سے کمرہ کسی غار کی مانند دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ جب میں نے لیمپ کی بتی نیچی کی تو کیڑے مکوڑے بھی قدرے خاموش ہو گئے۔ جب باتھی اندر آئی تو اس کے پاؤڈر اور بالوں میں لگے ہوئے پومیڈ کی خوشبو ساتھ آئی۔ وہ جانتی تھی کہ کل کچہری میں جینا داس کے ساتھ اپنی شادی شدہ زندگی کا آغاز کرے گی۔ میں نے کچہری جانے کے لیے اسے ایک ساڑی اور اس کے ہم رنگ بلاؤز کے لیے کچھ کپڑا خرید دیا تھا۔ یہ دو دن پہلے کی بات تھی۔ اس نے ایک پورا دن بلاؤز کی کٹائی اور سلائی پر صرف کیا تھا۔ اس نے بلاؤز کاٹ لیا تھا اور پھر اسے اتنی ہی فکر مندی سے اپنی الماری میں رکھ دیا تھا جیسے وہ کسی بچے کی دیکھ بھال کر رہی ہو۔ وہ کتنی خوشی سے شادی کر رہی تھی! اب مجھے اندازہ ہوا کہ جب سروجنی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں اکٹھے زندگی کا آغاز کر دینا چاہیے تو اس نے کتنی خوشی محسوس کی ہوگی۔

باتھی نے ادھر ادھر دیکھا جیسے حیران ہو رہی کہ اسے تاریک کمرے میں کیوں بلایا گیا ہے۔

''کل ہم کچہری جا رہے ہیں۔ تمہاری شادی کا اندراج پونے تین بجے ہوگا۔ یہ مبارک وقت ہے۔'' میں نے اس خیال سے کہا کہ وہ پرسکون ہو جائے۔

''مجھے یاد ہے۔'' اس نے خوشی سے کہا۔

''میں نے پوسٹ ماسٹر سے بھی کہا ہے کہ وہ کچہری آجائے۔ میں نے اور کسی کو نہیں بلایا۔ تمہیں اس کے آنے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''اگر سروجنی دیدی اور سری داس صاحب بھی آجائیں تو مجھے خوشی ہوگی۔''

میں نے انہیں بلانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اگر میں نے انہیں بلایا ہوتا تو وہ ضرور آتے۔

''میں نے سری داس کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ کیا سروجنی جانتی ہے کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے؟''

''میرا خیال ہے وہ نہیں جانتیں۔ میں نے کبھی ان سے زیادہ بات نہیں کی۔''

''پھر تمہیں اسے بلانے کا خیال کیوں آیا؟''

''میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بلایا جائے تو وہ ضرور آئیں گی۔''

''اب انہیں بلانے کا وقت نہیں۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں صبح سری داس سے کہوں گا۔ میرے پاس رہتے تمہیں تقریباً دس برس ہو چکے ہیں۔'' میں نے نیچے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہ دیکھ سکے کہ میں کتنا افسردہ ہوں۔ وہ صرف آٹھویں جماعت تک پڑھی تھی لیکن ایسی چیزوں کے بارے میں بہت باریک بین تھی۔

''کیا تمہیں گھر چھوڑنے کا دکھ نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صاحب'' ہم آپ سے ملنے آتے رہا کریں گے۔'' اس نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔

اس طرح کے گھٹیا شعر لکھنے پر میری ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اس نے مجھے پرانے طریقے سے مخاطب کرنا ترک کر دیا تھا۔ اس نے مجھے اس دن سے ''صاحب'' کہنا شروع کیا تھا جب مینکا میرے گھر آئی تھی اور باتھی اور اس کی ماں کو کھری کھری سنا کر گئی تھی۔

''میرا خیال تھا کہ تم عمر بھر یہیں رہو گی۔''

اس نے بے چینی سے دوسری طرف دیکھا۔ میں نے اسے جینا داس سے ملنے پر صرف ایک مرتبہ ڈانٹا تھا۔ یہ اس دن کی بات ہے جب مینکا نے مجھے باتھی کے اسے لکھے

ہوئے دو خط دکھائے تھے۔ جب میں نے دیکھا تھا کہ وہ کتنی خود سر ہے تو میں نے اسے ڈانٹنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن کل اس کی شادی جینا داس سے ہو رہی ہے۔ مجھے غصے میں آئے بغیر اسے اپنی ناپسندیدگی سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا۔

''تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ میرا نہیں خیال تھا کہ تم جینا داس جیسے آدمی کی محبت میں گرفتار ہو گی۔''

''نہیں صاحب، کیا میں عمر بھر آپ کے گھر میں رہوں گی؟'' اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے عمر بھر اپنے ساتھ رہنے کے لیے نہیں کہا۔''

''آپ نے کبھی ایسا نہیں کہا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ ایسا ہی چاہتے ہیں۔''

مجھے غصہ آنے لگا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ قصور کس کا ہے؟ اس کا یا میرا۔ اگرچہ میں درمیانی عمر کا تھا لیکن باتھی کے متعلق میرے خیالات کسی ناتجربہ کار نوجوان کے سے تھے۔ باتھی جوان تھی لیکن ناتجربہ کار نہیں تھی۔ اس کی سب سے پہلی ترجیح ہمیشہ اپنی ذات ہوتی تھی۔ اپنے مفادات کا خیال رکھنے کے معاملے میں وہ یقیناً مجھ سے بہت بہتر تھی۔

جب وہ اپنی ماں کے ساتھ میرے پاس آئی تھی تو ایک چھوٹی سی غریب لڑکی تھی۔ میں نے ترس کھا کر اسے کپڑے دیے اور سکول بھیجا لیکن میرے ترحم میں احمقانہ جذبے کی آمیزش زیادہ تھی۔ ایسا سوچنا محض حماقت ہی تو تھی کہ وہ عمر بھر میرے ساتھ رہے گی۔ میں اس پر حکم چلانا چاہتا تھا۔ لیکن جب اس نے مجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک نوجوان کا انتخاب کر لیا تھا تو اس کو ڈانٹنا یا وعظ سنانا خلوص سے زیادہ ناپختگی کا اظہار ہوتا۔

''میرا خیال تھا کہ تمہاری شادی اپنے دفتر کے کسی کلرک سے کروں گا۔''

میں اپنے اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور میں نے ایسا اس لیے کہا کہ مجھے اور نہ سوجھا۔

''میں کسی کلرک سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے ناراضگی سے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ابھی تک اسے جینا داس سے شادی کرنے سے روکنے کی کوشش کر رہا ہوں، میں اسے اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا ہوں اور کلرک والی تجویز محض بہانہ بازی ہے۔ ایسا سوچ

کر وہ مجھ سے کوئی ناانصافی نہیں کر رہی تھی کیونکہ میں جب بھی جینا داس کے لیے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے بارے میں سوچتا میرے ذہن میں باتھی کی شادی کسی کلرک سے کرنے کا خیال آجاتا۔ لیکن میں نے کبھی کسی کلرک کو اس قسم کی کوئی تجویز پیش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

میں نہیں جانتا کہ ایسا اس لیے ہے کہ میں لاتعلقی کو بہت بڑی خوبی گردانتا ہوں لیکن میں نے ہمیشہ لوگوں سے غصے کا اظہار نہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ حتیٰ کہ میں ان لوگوں سے بھی ہمدرانہ برتاؤ کرنے کی کوشش کرتا ہوں جنہیں میں بالکل پسند نہیں کرتا۔ بہر حال اس نے میری خود اعتمادی کو تباہ کر دیا ہے۔

بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ باتھی کے ساتھ میرا برتاؤ کسی منافق کا سا تھا۔ دوسرے موقعوں پر مجھے محسوس ہوتا کہ میں نے ترس کھا کر پورے خلوص سے اس کی پرورش کی۔ میرا کردار ان خوبیوں کا آمیزہ ہے۔ میں جب ان سب باتوں کے متعلق سوچتا ہوں تو میری خود اعتمادی گرم مکھن کی طرح پگھل جاتی ہے اور میں خود سے یہ کہہ کر اسے بحال کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ بہترین انسان بھی ایسے ہی مخلوط کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ خود پسند ہوئے بغیر اپنی زندگی کو کامیاب بنانا ناممکن ہے۔

اٹھارہواں باب

سری داس اور سروجنی چند دن سے سروجنی کے والدین کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے کیونکہ اس کے والد کی حالت بہت خراب تھی۔ سروجنی اپنے والد کی دیکھ بھال خود کرتی تھی اور شاذ و نادر ہی ان کے بستر کے پاس سے ہٹتی تھی۔ جب میں نے انہیں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ بہت مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ اتنا فرق صرف تکلیف کی وجہ سے نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں نے ان کے چہرے پر بیماری کی لکیریں دیکھیں اور صرف موت کے بارے میں سوچ سکا۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ تمہارے والد اتنے بیمار ہیں۔'' میں نے کہا۔ اس کا غمزدہ چہرہ دیکھ کر میں افسردہ ہو گیا۔

''یہ دو ہفتے سے بیمار ہیں۔ شروع میں تو ہمیں اندازہ ہی نہیں تھا حتیٰ کہ وید جی نے بھی ان کی بیماری کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔'' سروجنی نے میرے آگے آگے کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ اس نے یہ کہنے کے لیے میرے تھوڑا قریب آتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا:

''وید جی نے ہمیں صرف تین روز پہلے بتایا ہے کہ ابا شدید بیمار ہیں۔''

''کیا جب سے وہ بیمار ہوئے ہیں تم یہیں رہ رہی ہو؟''

''ہاں۔ میں صرف یہ دیکھنے کے لیے ایک دو بار گھر گئی ہوں کہ وہاں سب کچھ

ٹھیک ہے۔ سری داس بھی پچھلے چار دنوں سے یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔''

''کیا تمہارے والد آج زیادہ بیمار دکھائی دے رہے ہیں؟''

''ہاں، بہت زیادہ۔ سری داس کسی اور وید کو بلانے کا سوچ رہا ہے۔''

سروجنی شروع سے اپنے بیمار والد کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ ان کی حالت یقیناً بتدریج بدتر ہوئی تھی لہٰذا اس نے ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ ظاہر ہونے والے مہلک نشانات کو محسوس نہیں کیا تھا لیکن میں نے آخری مرتبہ اس کے والد کو دو یا تین مہینے پہلے دیکھا تھا۔ وہ اتنے بدل چکے تھے کہ مجھے محسوس ہوا کہ ان کا آخری وقت قریب ہے۔؛

''انہیں کسی اور وید کو دکھانا بہتر ہوگا۔''

''سری داس ویدوں کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ اگر تمہیں کسی اچھے وید کا علم ہو تو برائے مہربانی اسے بتا دو۔ ابا کو انگریزی دوائیں پسند نہیں ہیں۔ اروندا، کیا ان کی حالت بہت خراب ہے؟''

میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ چند ہی روز میں فوت ہو جائیں گے۔ لیکن میں نے اس احساس کو دبایا اور کہا:

''وہ خاصے بیمار نظر آتے ہیں لیکن ان کی حالت حقیقتاً زیادہ خراب نہیں ہوسکتی۔''

''کیا آج باتھی کی شادی ہو رہی ہے؟''

میں اس کا سوال سن کر حیران رہ گیا کیونکہ میں نے سری داس کو باتھی کی شادی کے بارے میں صرف چند منٹ پہلے بتایا تھا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''باتھی نے مجھے خط لکھا تھا۔''

''کب؟''

''کل صبح۔''

باتھی نے اسے خط کیوں لکھا تھا؟

''اگر ابا بیمار نہ ہوتے تو میں ضرور آتی اور اگر میں آتی تو سری داس بھی ساتھ آتا۔'' سروجنی نے کہا۔

''میں نہیں جانتا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتی ہو۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ میری تو بس اس سے چند مرتبہ بات ہوئی ہے۔''

میں نے سوچا کہ کہیں ان کا تعلق اس سے زیادہ گہرا تو نہیں۔ مجھے یاد آیا کہ باتھی نے بھی کہا تھا کہ اس کی کبھی سروجنی سے کوئی لمبی چوڑی بات چیت نہیں ہوئی۔ غالباً سروجنی کے متعلق کچھ چھپا رہی تھی۔

''کیا باتھی تم سے اکثر ملنے آتی تھی؟''

''نہیں۔'' اس نے قدرے زچ ہو کر کہا۔ ''میں نے اس کے ساتھ تعلق بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے تو اس سے صرف چند مرتبہ بات کی ہے اور وہ بھی تب جب میری اس سے کبھی اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے ملنے نہیں آتی تھی۔ اس نے مجھے جینا داس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔''

اس نے آخری چند الفاظ کا اضافہ یقیناً اس لیے کیا تھا کہ میں یہ نہ محسوس کر سکوں کہ وہ میرے سوال سے ناراض ہوئی ہے۔

''اروندا، برائے مہربانی ابا کو دوبارہ دیکھنے ضرور آنا۔'' اس نے ان کے کمرے میں واپس جاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ان کے پاس رہنا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں تمام وقت ان کے قریب رہوں۔ اماں کو گھر اور ابا کے کاروبار کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔''

میں مینکا سے ملنے چلا گیا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ باتھی کے ساتھ اکیلے کچہری جانے کی بجائے اگر میں اسے بھی ساتھ لے لوں تو بہتر ہوگا۔ باتھی نے یقیناً سروجنی کو شادی میں بلانے کے لیے خط لکھا ہوگا۔ وہ دنیا کو مجھ سے بہتر جانتی تھی۔ میں عوامی رائے کو بڑی لاپرواہی سے نظر انداز کر دیتا ہوں اور پھر اس کے بارے میں پریشان ہونا شروع کر دیتا ہوں۔

مینکا مجھ پر برس پڑی۔ سری مل گھر پر نہیں تھا لہٰذا اس کی باتیں سننے کے لیے میرے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔

''کیا تم نے یہ سب کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کیا تھا؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ اس نے ایک پرانی ساڑی پہن رکھی تھی جو ان تین چار ساڑیوں میں سے تھی جو وہ

برسوں سے پہنتی چلی آ رہی تھی۔

''ڈیڈی، اتنا زور سے مت بولو۔ ملازم سن لیں گے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ پہلے سے زیادہ مغرور ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ گزرتے برسوں سے اس کے چہرے پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

''ملازم باورچی خانے میں ہیں۔ وہ کچھ نہیں سن سکتے۔ پھر بھی میں دیکھ لیتی ہوں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔'' وہ اٹھی اور باروچی خانے میں جھانک کر واپس آ گئی۔ ''اور تمہارا اس بے شرم لڑکی کے ساتھ کچہری جانے اور اس کی شادی اس جانور سے کرنے کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا ملازم اس کے بارے میں نہیں سنیں گے؟'' میں نے اسے پہلے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''اس سے مجھے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوگی۔ لیکن اگر انہوں نے تمہیں باتھی کے بارے میں اتنے غصے سے باتیں کرتے سن لیا تو ان کے دماغ میں دوسرے خیال آ سکتے ہیں۔''

وہ حقارت سے ہنسی۔

''دیہاتیوں کے تو پہلے ہی بہت عرصے سے ایسے خیالات ہیں۔ ایک عورت جو اس قسم کے آدمی کو خط لکھتی تھی اور اس کے ساتھ بھاگنا چاہتی تھی! اور اب تم اس کی شادی اس کے ساتھ کرنے لگے ہو۔ کیا تمہیں ذرا بھی شرم کا احساس نہیں ہے؟ تمہیں جرات کیسے ہوئی کہ مجھے اپنے ساتھ کچہری چلنے کا کہو!'' اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں بے لباس کھڑا ہوں۔

''جب سروجنی مجھ سے محبت کرتی تھی اور مجھے خط لکھتی تھی اور ان میں سے ایک میں تو اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں اسے جہاں لے جانا چاہوں گا وہ میرے ساتھ چلے گی، چاہے اس کے والدین کو یہ پسند ہو یا نہ ہو۔ اس وقت تو تم پوری طرح ہمارے ساتھ تھیں۔'' میں نے اسے منانے کے انداز میں کہا۔

مینکا ہنس دی، غالباً مجھے یہ بتانے کے لیے کہ وہ مجھے احمق سمجھتی ہے۔

''سروجنی اور تم باعزت خاندانوں سے تعلق رکھتے ہو۔ سروجنی تمہیں گھٹیا شعر نہیں لکھتی تھی۔ وہ تمہیں رات کے وقت اپنی کھڑکی پر نہیں بلاتی تھی۔ وہ تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ وہ اس ناپاک لڑکی کی طرح جس کی تم نے پرورش کی ہے کسی بدمعاش آوارہ گرد کی طرح نہیں ہوگئی تھی۔'' اس نے کہا لیکن بہت آہستگی سے۔ اس کا غصہ غائب ہوگیا تھا اور اس کا چہرہ اداس ہوگیا تھا۔

''میرا ارادہ سروجنی کے والدین کا باتھی کے والدین سے یا خود سروجنی کا باتھی سے موازنہ کرنے کا نہیں تھا۔ یہ میری حماقت ہوگی۔ میں تمہیں صرف یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ تم ناانصافی کر رہی ہو۔''

''میں نے باتھی کے بارے میں اتنی باتیں صرف اس لیے کی ہیں کیونکہ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ تم سچائی اور منصف مزاجی کے متعلق سب کچھ بھول چکے ہو۔ وہ میری کیا لگتی ہے؟ تم نے اس جنگلی کو گاڑی کا تحفہ دیا ہے! تم باتھی کو پانچ ہزار روپے کا جہیز دو گے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اسے پانچ ہزار روپے دینے کا ارادہ رکھتا ہوں؟''

''تمہیں واقعی کچھ نظر نہیں آتا۔'' اس نے ترس کھاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''اگر تم نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہوتیں تو تمہیں مجھ سے ایسے سوال نہ کرنے پڑتے۔ کوئی بھی دو انسان بالکل ایک جیسے نہیں ہوتے...... یا دو خاندان...... حتیٰ کہ دو بھائی بھی نہیں۔ کیا تم دو ناریل کے درخت بھی تلاش کر سکتے ہو جو بالکل ایک جیسے ہوں۔ اگر آپ دو درختوں کے درمیان فرق نہیں مٹا سکتے تو کیا گاؤں میں موجود لوگوں یا خاندانوں کے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں؟ تمہیں کبھی یہ سوچنے کا خیال نہیں آئے گا کہ باتھی کا جاہل عاشق گاؤں میں ہر طرف اس بارے میں بڑ ہانکتا پھرتا ہے۔ تم کبھی آگے کا نہیں سوچتے۔''

''کیا باتھی کو پانچ ہزار روپے دینا غلط ہے؟ وہ تقریباً نو برس میری خدمت کرتی رہی ہے۔''

''تو یہ خیال تمہیں صرف ابھی آیا ہے! بات پانچ ہزار روپے کی نہیں ہے۔ اگر تم نے معاملات کو صحیح طرح سنبھالا ہوتا تو تم اسے دس ہزار روپے بھی دے سکتے تھے۔ اماں

ایک عجیب وغریب گھر میں قابلِ رحم زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ میرے ساتھ رہنے کے متعلق سننا نہیں چاہتیں۔تم نے یہ نہیں سوچا کہ انہیں اپنے ساتھ رہنے کا کہو۔"

میں یہ بات خاموشی سے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"لیکن ان کو گھر سے نکالا تو تم نے تھا۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" اس نے دیانت داری سے کہا۔"کیا انہیں یہ بتانا غلط تھا کہ ابا نے ہم سے پیسے لیے ہیں؟ انہوں نے گھر اور زمین ہمارے نام لکھنے کے بعد پیسے لیے تھے۔ اماں کو گھر کس لیے چاہیے؟ اگر وہ آوارہ لڑکی تمہارے گھر میں نہ ہوتی تو اماں تمہارے کہے بغیر بھی تمہارے ساتھ رہنے کے لیے آجاتیں۔"

میرا ذہن ایسے تڑپا جیسے چابک رسید کیا گیا ہو۔لیکن میری عقل نے مجھے بتایا کہ اس کی زیادہ تر باتیں محض پرانے انداز کی خودغرضانہ بکواس ہیں۔ میری عقل نے اس کی قدامت پسندی کو رد کر دیا اور مجھے بتایا کہ وہ غلط ہے۔لیکن میرے پرانے طریقوں سے پروان چڑھے ہوئے احساسات اس کی طرف تھے۔ اپنے احساسات اور عقل کے درمیان جاری جنگ سے تھک ہار کر میں نے یوں جواب دیا جیسے میں سونے کے بالکل قریب ہوں:

"میں اماں کو ہر مہینے دوسو روپے بھیجتا ہوں۔ وہ کہتی ہیں کہ انہیں اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ رہنے کے لیے اس لیے نہیں کہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ نہیں آئیں گی۔"

مینکا نے اپنی بات جاری رکھی جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو:

"تم نے اپنے لیے علیحدہ گھر اس لیے لیا کیونکہ تم کسی تارک الدنیا کی طرح رہنا چاہتے تھے۔تم نے یہ سب صرف اس لیے کیا کیونکہ تم بہت زیادہ شرمندہ تھے کہ سروجنی تمہیں بزدل سمجھتی ہے۔ پھر تم نے باتھی کی پرورش کرنی شروع کر دی اور بتدریج ایسی منافقانہ زندگی بسر کرنے لگے۔"

وہ کلی طور پر غلط نہیں تھی اور جو تھوڑا بہت جانتی تھی اسے بڑھا چڑھا کر بیان کر رہی تھی۔ وہ اتنی عقلمند نہیں تھی کہ میرے ذہن کو صحیح صحیح پڑھ سکتی۔ یہ خاصا حیرت انگیز تھا کہ گو

ہم ایک ہی والدین کی اولاد تھے اور انہی نے ہماری پرورش کی تھی لیکن وہ مجھے اتنا کم جانتی تھی۔ درحقیقت میری جو شبیہہ وہ کھینچتی تھی میں اس میں خود کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

وہ ہمیشہ مجھ پر رعب جمانے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرنے کے لیے ذرا بھی قوت صرف نہیں کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے آپ کو خوب سمجھتی ہے اور خود پر مکمل اعتماد کے ساتھ سوچتی اور عمل کرتی تھی۔

''تم نے اس نکمے شخص کو صرف اس لیے گاڑی خرید کر دی ہے تا کہ تم باتھی کو خوش کر سکو۔ حالانکہ تم اس بات پر واقعی ناراض ہو کہ باتھی اس بدمعاش سے محبت کرنے لگی ہے۔تم میں اتنی عقل نہیں ہے کہ ان دونوں سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنی زندگی بسر کرو۔''

اگر چہ میں خود بھی زیادہ اعتدال پسند نہیں تھا لیکن باتھی میں اعتدال پسندی کی کمی مجھے ناقابل برداشت لگی۔ یہ یاد کرنا خوشگوار نہیں تھا کہ میں نے اماں کا ذرا بھی سوچے بغیر باتھی پر اتنے پیسے خرچ کیے تھے۔

''تمہاری سب باتوں میں کچھ نہ کچھ سچائی ہے۔'' میں نے تکلیف سے کہا۔

''لیکن اب اس سلسلے میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ برائے مہربانی ناراض ہونا بند کرو اور کہہ دو کہ تم میرے ساتھ کچہری چلو گی۔''

''میں باتھی کی شادی میں نہیں آ رہی۔ مجھے ایسا کرنے کے لیے نہ کہو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔تم نہیں چاہتے کہ وہاں جاتے ہوئے گاڑی میں اس کے ساتھ اکیلے دیکھے جاؤ۔ یہ بات بھی تمہاری سمجھ میں آج آئی ہے۔''

''اسی لیے تو میں تمہیں اپنے ساتھ کچہری چلنے کا کہہ رہا ہوں۔''

جب میں نے فیصلہ کیا تھا کہ باتھی کو کسی اور کے حوالے کرنے کچہری خود سے لے کر جاؤں گا تو میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ میں نے اس کے متعلق صرف تب سوچا جب باتھی نے سروجنی کو شادی پر مدعو کرنے کا کہا۔

اگر کوئی شخص خلوص سے اور دنیا کے طریقوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اسے تذلیل اور گالیاں سنتے رہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ بہت مشکل لگے تو زیادہ بہتر ہے کہ ہار مان لی جائے اور خالصتاً روایتی زندگی

گزاری جائے۔

مجھے دیہاتیوں کی تہمت آمیز باتیں نہ سننا پڑتیں اور اگر میں کبھی سن بھی لیتا تو وہ بمشکل میرے کانوں کے پردے پھاڑ سکتیں اور میرے دماغ میں جگہ بناتیں۔ لیکن میں ان لوگوں کے سامنے باتھی کو گاڑی میں اکیلا کچہری کیسے لے جا سکتا تھا؟

''اروندا، میں کچہری نہیں آسکتی۔'' مینکا نے مجھے دوبارہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہرو، جانے سے پہلے کچھ کھالو۔ بہر حال میں دھرم داس کے بغیر کیسے جا سکتی ہوں؟'' بظاہر وہ افسردہ نظر آرہی تھی۔

''میں کسی اور وقت تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔'' میں نے جاتے ہوئے کہا۔

سکول کے بچوں کو دوپہر کے کھانے کے لیے گھر لے جانے والی دو گاڑیاں سڑک پر آرہی تھیں۔ دونوں گاڑیوں میں غالباً چھ چھ بچے تھے اور انہیں ایک ایک بیل کھینچ رہا تھا۔ جیسے ہی میں ان کے قریب پہنچا دو تیز رفتار کاروں کی وجہ سے وہ گاڑیاں سڑک کے ساتھ نالے میں گرنے لگی تھیں۔ ان میں سے ایک کار وہ تھی جو میں نے جینا داس کے لیے خریدی تھی۔ بہر حال وہ اسے خود نہیں چلا رہا تھا۔ غالباً اس نے اپنے کسی دوست کو کوئی چیز لانے بھیجا تھا۔

جب میں گھر پہنچا تو باتھی پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ اسے کوئی بھی دلہن نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑی اور ہلکے نیلے رنگ کا ہی بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس نے اپنے بالوں میں موتیے کے پھولوں کا گجرا سجا رکھا تھا۔ دلہنیں عموماً اپنے بالوں میں لگاتیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آیا یہ اس کی بالیوں کی وجہ سے تھا، جن کے موتی پتلی تاروں سے لٹکے ہوئے تھے، لیکن اس کا چہرہ حیرت انگیز طور پر خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔

''میں وقت سے پہلے ہی تیار ہوں۔'' اس نے خوشی سے کہا۔

وہ اتنی خوش کیوں تھی جبکہ جلد ہی وہ مجھے اور اپنی ماں کو چھوڑنے والی تھی؟ میں دو ایسی دلہنوں کو دیکھ چکا تھا جنہوں نے اپنا عروسی جوڑا پہنتے ہی رونا شروع کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دلہنیں جب ہمیشہ کے لیے اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر جاتی ہیں تو صرف غم کی

وجہ سے نہیں روتیں بلکہ خوشی اور غم کی آمیزش کی وجہ سے روتی ہیں۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم جلدی تیار ہو گئی ہو......سروجنی کے والد بہت بیمار ہیں۔''

''اوہ! کیا ان کی حالت بہت خراب ہے؟'' اس نے بے چینی سے کہا۔

سروجنی کسی بھی طرح باتھی کی جاننے والی نہیں تھی لیکن باتھی اس کی طرف بہت مائل تھی۔ بظاہر سروجنی بھی باتھی کو خاصا چاہتی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس نے باتھی کی شادی کے لیے کچہری جانے پر غور بھی نہ کیا ہوتا۔ اگر میں درمیان میں نہ ہوتا تو غالباً مینکا نے بھی باتھی کو قبول کر لیا ہوتا۔ بظاہر باتھی صرف اپنی ماں کے لیے کوئی جذبہ نہیں رکھتی تھی۔ وہ اس ملازمہ سے کیسے محبت کر سکتی تھی جو میری غلامی کرتی تھی۔

''سروجنی کہہ رہی تھی کہ اگر اس کے والد بیمار نہ ہوتے تو وہ آج کچہری ضرور آتی۔''

جب میں کھانے کے لیے بیٹھا تو حیران رہ گیا۔ میز ہر قسم کے کھانوں سے لدی ہوئی تھی۔ باتھی کی ماں باتھی سے بھی زیادہ خوش نظر آتی تھی۔ اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے اور پلیٹیں دوبارہ بھرنے میں بہت مصروف تھی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ جتنا تھکا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے اسے گھر کے خرچ کے لیے جو پیسے دیے تھے ان سے یہ سب کچھ نہیں خریدا جا سکتا تھا۔

''تم نے یہ سب کیوں پکایا ہے؟'' میں نے کچھ غصے سے پوچھا۔

''صاحب، آخر کار یہ ہمارے لیے بہت بڑا دن ہے!'' اس نے ایسے مسکراتے ہوئے کہا جس سے اس کا چہرہ مکمل طور پر مختلف دکھائی دینے لگا۔

باتھی نے اپنے کمرے میں اکیلے کھانا کھایا۔ میں نے ایک سفید قمیض پہن لی اور اپنی ایک پرانی سرخ ٹائی لگا لی۔ میں اپنے بالوں میں کنگھی کرنے کے لیے شیشے کے پاس گیا۔ میں ہلکا سا گنجا ہو رہا تھا اگرچہ ابھی میرے بالوں میں سفید کا شائبہ ڈھونڈنا مشکل تھا۔ لیکن میں اپنے چہرے میں آنے والی تبدیلی پر خاصا خوفزدہ ہو گیا۔ جس چہرے کو میں جانتا تھا اس کی جگہ میں نے ایک تباہ حال چہرہ دیکھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے چہرے میں

تبدیلی ایک رات میں نہیں آئی تھی بلکہ میرے محسوس کیے بغیر بتدریج آئی تھی۔

میں باتھی کے ساتھ چھوٹی سی کار میں بیٹھ گیا۔ ہم صرف اس صورت میں راہگیروں اور دروازوں پر کھڑے ہوئے لوگوں کی نظروں میں آتے اگر وہ خاص طور پر ہماری تاک میں ہوتے۔ مجھے باتھی کے ساتھ بیٹھنا بہت خوشگوار معلوم ہوا جو اپنے نئے کپڑوں میں ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ کار اتنی چھوٹی تھی کہ ہماری جسم تقریباً مس ہو رہے تھے۔ راستے میں موجود لوگوں نے ہم میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ صرف ایک شخص نے مجھے پہچانا اور دوبارہ ہماری طرف دیکھا۔ مجھے احساس ہوا کہ کچہری میں موجود لوگ بھی شاید مجھے پہچان لیں اور ہمارے بارے میں متجسس ہوں۔ وہ جو چاہیں سوچیں، میں ان کے بارے میں پریشان کیوں ہوں؟ اگر وہ مجھ پر ہنستے بھی تو اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟

ایک پرانی کہانی ہے کہ کسی برہمن کے ساتھ ایک لڑکی رہتی تھی جس کی پرورش ایک بوڑھی عورت نے کی تھی۔ جب وہ لڑکی جوان ہوئی تو اس نے اسے اپنی بیوی بنا لیا۔ لیکن اس لڑکی کو ایک اور نوجوان سے محبت ہوگئی۔ ایک دن کھیل کھیل میں اس نے برہمن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور پھر اپنے عاشق کے ہاتھوں اس بوڑھے آدمی کی خوب پٹائی کرائی اور خود خوش ہوتی رہی۔

لوگ شاید میرا موازنہ اس برہمن سے کریں اور میری ہنسی اڑائیں! لیکن یہ کہانی سب کو کہاں یاد ہوگی؟ لیکن ایسی کہانیاں تو سب جانتے ہیں، خاص طور پر ہمارے دیہاتی۔

جب کار کچہری کے پاس پہنچی تو میں شرم سے سکڑا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ میں باتھی سے پہلے کار سے اترنا بھی بھول گیا۔ وہ پہلے اتری اور میری طرف دیکھا۔ میں جلدی سے باہر آ گیا۔ ''میں ہر چیز بھول رہا ہوں!'' میں بمشکل اپنے ارد گرد دیکھنے کی جرات کرتے ہوئے کہا۔

میں دروازے پر نظریں جمائے کچہری کے اندر چلا گیا۔ تین کسانوں کے سوا، جو یقیناً کسی دستاویز یا رسید کے سلسلے میں آئے ہوں گے، وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ کچہری میں موجود کلرک مجھ سے طرح طرح کے سوال پوچھیں گے لیکن ایک

چپڑاسی جو کوئی کتاب اٹھائے وہاں سے گزرا اس نے ہماری طرف دوسری مرتبہ دیکھا تک نہیں۔ جن دو یا تین کلرکوں کو میں نے دیکھا انہوں نے میری طرف دیکھنے کی بجائے باتھی کی طرف دیکھا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ اگر کوئی نوجوان عورت شادی کرنے کی بجائے کچھ اور لینے آتی ہے تو انہیں زیادہ تجسس ہوتا۔

باتھی اور جینا داس کی شادی کا اندراج بھی بندوق کا لائسنس جاری کرنے کی طرح فارم بھرنے سے ہوا۔ جب میں نوجوان تھا تو مجھے یہ سب بے معنی دکھائی دیتا تھا کہ شادی کو اتنی پر اسراریت اور سنجیدگی سے لیا جائے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ محض ایک فارم بھرنے کی بات ہے تو میں کتنی خوشی سے سروجنی کے ساتھ کچہری چلا گیا ہوتا!

کولا سوریا اور میں گواہ تھے۔ باتھی نے انگریزی اور جینا داس نے سنہالی میں دستخط کیے۔ وہ صرف ایک سنہالی سکول میں گئی تھی لہٰذا اس نے انگریزی میں دستخط کرنے پر ایک خاص جوش و ولولہ محسوس کیا ہوگا۔

''مل جل کر اچھی زندگی بسر کرنا!'' جب حد درجہ خوش باتھی اور جینا داس آخر کار اپنی کار میں بیٹھ رہے تھے تو کولا سوریا نے ان سے کہا۔

''پوسٹ ماسٹر صاحب، بہت بہت شکریہ۔'' باتھی نے شادمانی سے کہا۔

انیسواں باب

جب تین دن بعد وہ لوٹے تو باتھی میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اپنی انگلیوں سے میرے پاؤں چھو کر مجھے سلام کیا۔

اس کے بعد جب وہ دوبارہ کھڑی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ جینا داس حقارت سے ہنس رہا ہے۔ باتھی نے اسے قہرآلود نظروں سے دیکھا۔ اس دوران اس کی آنکھیں دو گیلے کنچوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ جینا داس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ باتھی، جس کی آنکھیں ابھی تک اس پر مرکوز تھیں، بڑبڑائی: ''ان کے پاؤں چھوؤ۔'' جینا داس بلا تاخیر میرے آگے جھک گیا اور پھر دوبارہ باتھی کی طرف دیکھ کر کھیسیں نکالنے لگا۔

انہوں نے میرے ساتھ دو دن گزارے۔ میں شادی کے صرف دو یا تین روز بعد ہی باتھی میں آنے والی اس تبدیلی پر حیران تھا۔ وہ ذہن و جسم دونوں کے اعتبار سے خاصی مختلف دکھائی دیتی تھی۔ اس نے نہ صرف میرا کمرہ بلکہ پورا گھر صاف کیا۔ اس نے میری الماری کھولی، تمام کپڑوں کو ہوا لگائی اور ان سب کو ترتیب سے رکھا۔ ''ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا۔'' اس نے اپنی ماں سے کہا۔ اس نے جینا داس کو باڑ دکھائی اور پرانی لکڑیوں کو تبدیل کرنے پر لگا دیا۔ اگرچہ جینا داس کسی پہلوان کی طرح مضبوط تھا لیکن باتھی کی تمام باتیں پوری اطاعت شعاری سے سنتا تھا۔

مجھے یوں لگا کہ باتھی کے کردار میں اس کے سکول کے زمانے کی تمام کشش لوٹ

آئی ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب اس کے چہرے پر ایک کھلاڈلاپن آ گیا تھا۔ جب وہ سکول کی طالبہ تھی تو اس نے میری مدد سے میری کھڑکی کے باہر کیلے کے کچھ درخت لگائے تھے جو گرم ترین موسم میں بھی میرے کمرے کی ہوا کو ٹھنڈا اور خوشگوار رکھتے تھے۔ شام کے وقت یہ ٹھنڈک میرے جسم کے لیے مرہم کا کام کرتی اور جیسے ہی میں سانس لیتا میرے دل کو تقویت پہنچاتی۔ اپنے تھکے ماندے اعضا کو سکون پہچانے کے لیے میں کھڑکی کے قریب بستر پر لیٹ جاتا اور ان شفا بخش لمحوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا۔ ایسے موقعوں پر باتھی مجھے جگائے بغیر پھیری والے سے مچھلی خرید لیتی تھی۔ وہ بلی کی طرح دبے قدموں میرے کمرے میں آتی تھی اور مچھلی والے کو دینے کے لیے میری جیب سے پیسے نکال لیتی تھی۔

جب وہ بڑی ہوئی تو بدل گئی۔ پھر یوں ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے لیے میری چاہت کو ناپسند کرتی ہے۔ اس نے مجھے ابا کہے بغیر مخاطب کرنے کے طریقے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ جس دن سے اس کا جینا داس کو لکھا ہوا خط میرے ہاتھ آیا تھا اس نے مجھ سے اپنے حقیقی جذبات چھپانے کی کوشش کی تھی اور میرا کام کرنے میں ذرا بھی خوشی محسوس نہیں کرتی تھی۔

جینا داس کے ساتھ اس کی شادی اور مجھے چھوڑ جانے کے بعد ہی مجھے پتا چلنا شروع ہوا کہ اس میں یہ تبدیلی میرے اندر کی تبدیلی کے ساتھ ہی آئی ہے۔ غالبًا اس نے سوچا ہوگا کہ میں اسے بھی ملازمہ بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ ایک مرتبہ ہماری گفتگو کے دوران اس نے اس کا اشارہ بھی دیا تھا۔

باتھی نے باغ میں جھاڑو دی اور کوڑے کو باڑ کے ایک کونے میں اکٹھا کر دیا۔ پھر اس نے اسے آگ لگا دی۔ مردہ پتوں نے جلد ہی آگ پکڑ لی اور بغیر دھوئیں کے شعلے بلند ہونے لگے۔ آگ کی روشنی میں ناریل کے درختوں کے پتے سرخ ہو گئے۔ چاند نیلے اور سفید بادلوں کے ہجوم میں کسی خمیدہ کنگھی کی مانند لٹکا ہوا تھا اور منظر پر چاندنی کی مسکراہٹ پھیلا رہا تھا۔

''تھوڑا سا پیچھے آ جائیں۔'' باتھی نے ایک چھڑی سے آگ کو کریدتے ہوئے مجھ سے کہا۔ شعلے باتھی کے چہرے کو روشن کرتے ہوئے کسی ایسے سانپ کی طرح بلند ہوئے

جسے ضرب لگائی گئی ہو۔

باتھی اب ایک ایسی عورت تھی جس نے زندگی کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ ابھی سکول میں ہی تھی تو اس میں ایک اچھی گرہستن بننے کی صلاحیت نظر آتی تھی۔ بعد ازاں جب وہ جوان ہوئی تو جذباتی ہیجان کی وجہ سے یہ آثار غائب ہو گئے تھے۔ اب وہ اپنے آپ کو دھوکا نہیں دیتی تھی بلکہ ایک پوری طرح بالغ عورت تھی جو گھریلو تربیت کی پیداوار تھی۔

باتھی اور جینا داس نے رات کا کھانا میرے ساتھ کھایا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ میز کھانوں سے لدی ہوئی ہے اور پلیٹیں ایک دوسری کے اوپر چڑھی ہوئی ہیں تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ یہ نمائش اس کی ماں میں نفاست پسندی کی کمی کا اظہار کرتی ہے یا صرف یہ کہ وہ پیسوں کے اتنے بے معنی ضیاع کو پسند نہیں کرتی تھی؟

ماں کی طرف سے اپنی چاہت کے اظہار کی کوشش بظاہر اسے زچ کر دیتی تھیں۔ اسے یقیناً احساس ہوگیا ہوگا کہ اتنے زیادہ کھانے محض اس کی ماں کے اپنے جذبات کے اظہار کا طریقہ ہیں۔ لیکن پرانے دنوں میں بھی باتھی اپنے لیے اپنی ماں کی چاہت کو بکواس سمجھتی تھی۔ باتھی کی ماں اس سے محبت کرنے پر مصر کیوں تھی جبکہ وہ واضح تھا کہ وہ اسے ''ماں'' کہنا بھی پسند نہیں کرتی؟ کیا کوئی کتا اپنے ایسے مالک کا وفادار رہتا ہے جو اسے صرف اسے لیے مارتا ہو کہ وہ اسے کھانا دیتا ہے؟ لیکن گوناوتی باتھی کی محتاج تو نہیں تھی۔

باتھی نے بغیر کسی جوش کے کچھ چاول اور تھوڑا سا سالن اپنی پلیٹ میں ڈالا۔ اس نے اپنی ناپسندیدگی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

''کوئی اتنی سبزیاں کیسے کھا سکتا ہے؟ میرے لیے تو دو ہی سالن کافی ہیں۔'' اس نے کہا۔ اس نے میری پلیٹ کی طرف دیکھا۔

''حتیٰ کہ مالک نے بھی صرف تین سالن لیے ہیں۔''

میں اس کے رویے سے بہت زیادہ خوش ہوا۔ جب میں کھانے کے لیے بیٹھا تھا

تو مجھے بھی شدید غصہ آیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ گوناوتی گنوار پن اور جذباتیت کا ثبوت دے رہی ہے۔

''میں نے اپنے لیے پانچ کھانے ڈالے ہیں۔'' جینا داس نے بے فکری سے کہا۔

''مشکل ڈالنے میں نہیں کھانے میں ہے۔'' باتھی نے غصے سے کہا۔

اپنے غصے میں اس نے ذرا بھی دھیان نہیں دیا تھا کہ اس کے گرد کیا ہو رہا ہے لہٰذا اسے نہیں پتا تھا کہ جینا داس کے لیے کھانا گوناوتی نے ڈالا تھا۔ اگر گوناوتی نے باتھی کے لیے بھی کھانا ڈالنے کی کوشش کی ہوتی تو اسے گول مول انداز میں ڈانٹ پڑتی۔ جیسے ہی ہم کھانا کھا کر اٹھے ایک چھوٹا ملازم کا لڑکا اپنی نظریں باتھی پر جمائے برتن اٹھا کر باورچی خانے میں لے گیا۔

جینا داس باہر باغ میں گیا اور سگریٹ پینے کے لیے باڑ کے دوسرے سرے کی جانب چل پڑا۔ آگ اب بجھ چکی تھی۔ کچھ بکھرے ہوئے انگارے اندھیرے میں جگنوؤں کی مانند چمک رہے تھے۔ رات کے آسمان کی لامحدود وسعت نے، جس کی گہری تاریکی کا مقابلہ صرف آہستگی سے ایک دوسرے کا جواب دیتے ہوئے ستارے ہی کر رہے تھے، میرے اندر ایک کامل بے وقعتی کا احساس پیدا کر دیا۔ اگر ایک طرف گہری تاریکی رات کے چین و سکون کا حصہ ہے اور ذہن کو مطمئن کرتی ہے تو دوسری طرف یہ ہمیں دنیا کی بنیادی پُرسراریت سے پریشان بھی کر سکتی ہے۔ جینا داس کے سگریٹ کا سرا ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی تاریکی میں کسی جگنو کی طرح چمکا۔

میں نے سری داس کو تب تک نہیں پہچانا جب تک وہ تقریباً برآمدے میں نہیں پہنچ گیا۔ چند لمحے پہلے میں نے کسی کو چھوٹا زینہ پھلانگتے دیکھا تھا جیسے گہری تاریکی سے فرار ہو کر روشنی میں آنے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ لیکن میرا ذہن دوسری سوچوں سے بھرا ہوا تھا اور جو کچھ میں نے دیکھا میں نے اس کی طرف بالکل توجہ نہیں دی تھی۔ جونہی باتھی نے سری داس کو پہچانا وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

سری داس ادھر کھڑا اپنے ارد گرد ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس گھر میں اجنبی ہو۔ آخر کار اس نے میری طرف دیکھا۔ اسے یقیناً یہ توقع نہیں تھی کہ باتھی اور جینا داس میرے گھر آئے ہوئے ہوں گے اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ باتھی یہاں ہوگی۔ کیا تم نے اسے یہاں رہنے پر آمادہ کر لیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ وہ پریشان دکھائی دیتا تھا اور اس نے وہ تکلیف، تجسس اور ناپسندیدگی چھپانے کی بالکل کوشش نہیں کی جو وہ محسوس کر رہا تھا۔

سری داس ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی کی برائی کرتا۔ اگرچہ وہ ایک زمیندار کا بیٹا تھا لیکن وہ غریب ترین کسانوں کی تقریبات میں بھی شرکت کرتا تھا۔ اس کی والدہ کو رتبے اور وقار کا بہت گہرا احساس تھا لیکن ان کے بھی ہر ایک کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ سری داس راستے میں ملنے والے کسی بھی غریب کسان سے باتیں کرتا لیکن وہ باتھی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ باتھی کی غلطی نہیں تھی۔ اس نے اب تک کبھی باتھی کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن باتھی کے جوان ہونے کے بعد اس نے میرے گھر آنا چھوڑ دیا تھا اور مجھ سے صرف تب بات چیت کرتا تھا جب ہم کہیں اور ملتے۔ اگر کبھی اسے مجھ سے ملنے کی ضرورت آن پڑتی تو وہ میرے دفتر آتا تھا۔

سری داس مینکا کی مجھ سے زیادہ عزت کرتا تھا اور وہ جو بھی کہتی اس پر توجہ دیتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مینکا نے اسے باتھی کے خلاف بھڑکایا تھا۔ وہ مینکا کی طرح باتھی کے بارے میں ہتک آمیز باتیں نہیں کرتا تھا لیکن اس نے کبھی مجھ سے اپنی ناپسندیدگی چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

اس نے جب یہ کہا تھا کہ ''کیا تم نے اسے یہاں رہنے پر آمادہ کر لیا ہے؟'' تو وہ اپنی خفگی کا اظہار کر رہا تھا، جیسے اسے مجھ پر شک ہو۔ وہ فوراً واپس جانا چاہتا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ صرف ملنے آئے ہیں۔ جینا داس نے گیتا مانا میں گھر لے لیا ہے۔'' میں نے اسے یہ ساری تفصیلات اس لیے بتائیں کیونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ مزید سوال نہ کرے۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں نے باتھی اور جینا داس کو اپنے ساتھ رہنے پر

آمادہ کرلیا ہے۔ اس نے مجھ سے چند اور سوال کیے:

''تمہارا مطلب ہے کہ باتھی یہاں رہے گی جبکہ جینا داس اپنے کام کی وجہ سے گیتا مانا میں رہے گا؟''

''نہیں، وہ دونوں وہاں رہیں گے۔''

سری داس اس پر مطمئن ہو گیا۔

''سارا کے والد اب بہت بیمار ہیں۔ میں یہی بتانے آیا تھا۔''

یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے مریض کی خبر گیری کے لیے نہ جا کر غلطی کی ہے۔ میں اسی شام جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن جب باتھی آئی تو میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں ان سے ملنے نہیں گیا۔ اب میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''میں نے وید جیا تلک کو انہیں دیکھنے کے لیے بلایا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ بہت شدید بیمار ہیں۔ میں نے سارا کو اس کے متعلق نہیں بتایا لیکن اسے پتا چل گیا ہے۔'' اس نے تاسف سے کہا۔

''جب میں نے آخری مرتبہ انہیں دیکھا تھا تو مجھے احساس ہو گیا تھا کہ بیماری خطر ناک ہے۔ میں نے سروجنی کو نہیں بتایا تھا کہ میں نے کیا محسوس کیا ہے۔ میں نے اسے صرف وید جیا تلک کو بلوانے کا کہا تھا۔''

''سارا نے مجھے بتایا تھا۔ اب مجھے ڈر اس بات کا ہے کہیں سارا خود بیمار نہ پڑ جائے۔ وہ رات رات بھر جاگتی ہے اور اپنا تمام وقت ابا کے قریب گزارتی ہے۔ اس کی تو بھوک بھی مر گئی ہے۔''

طبیب نے یقیناً سری داس کو بتایا ہوگا کہ مریض کا آخری وقت قریب ہے۔ اب اسے سروجنی کی طرف سے خطرہ تھا۔ اس کی ایک کزن نے اپنی بہن کی بیماری کے دوران اس کی تیمارداری کی تھی۔ اس کے مرنے تک کسی کو حتیٰ کہ طبیب کو بھی علم نہیں تھا کہ اسے تپ

دق ہے۔ اس کے انتقال کے چھ مہینے بعد جس بہن نے اس کی تیمارداری کی تھی وہ بھی چل بسی۔ سری داس کی بے چینی کی وجہ بھی یقیناً یہی تھی۔

''تمہاری کزن کی وفات تپ دق سے ہوئی تھی۔ وہ متعدی مرض ہے۔ تمہارے سسر کو ویسی کوئی بیماری نہیں ہے اس لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''جب تم وہاں جاؤ تو اسے کہنا کہ وہ نیند پوری کیا کرے۔ ڈاکٹر نے ہمیں بتایا تھا کہ نیلابی کا انتقال اس لیے ہوا تھا کہ اسے اپنی بہن کی تیمارداری کرتے ہوئے تپ دق ہو گئی تھی۔''

''کم سونے کی وجہ سے کبھی کسی کو تپ دق نہیں ہوتی۔ آپ کو جراثیم کسی ایسے شخص سے منتقل ہوتے ہیں جسے پہلے ہی یہ مرض ہو۔ سروجنی کے خاندان میں کسی کو یہ بیماری نہیں۔'' میں نے اس کے خدشات دور کرنے اور اسے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

سری داس کو یقیناً علم تھا کہ اس کے سسر کو تپ دق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ خدشہ کہ سارا بھی بیمار ہو جائے گی اس کی پریشانی کی واحد وجہ نہیں تھا۔ سارا کی اپنے والد سے محبت کی شدت اس کی والدہ کو پسند نہیں آتی تھی۔ سارا کے متعلق ان کی نکتہ چینی نے سری داس کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔

میں اس کے ساتھ باہر گیا اور ہم اس کی بیل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جن کچی پکی سڑکوں اور درختوں کے پاس بیل گاڑی گزری وہ سب تاریکی کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ بیل گاڑی کی لالٹینوں کی کمزور روشنی بمشکل بیل کے سر سے آگے تک پہنچتی تھی۔ بیل بمشکل اندھیرے میں خود کو گھسیٹ رہا تھا۔ سری داس نے گاڑی بان کو اس کی مرضی کے مطابق بیل گاڑی چلانے دی۔ اس نے اس بات پر اعتراض نہیں کیا کہ بیل بظاہر اپنی مرضی کر رہا ہے۔ وہ کبھی جلد بازی نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہوتا تھا۔

''کیا ہم بڑی سڑک کے نزدیک ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اندھیرے میں اس سے زیادہ تیز نہیں چلا سکتا۔ اگر میں نے کوشش کی تو

بیل درختوں سے ٹکرا سکتا ہے۔'' بوڑھے گاڑی بان نے کہا۔ اس کا تعلق گاؤں سے تھا اور وہ سری داس کے والد کے وقت میں ان کے لیے بھی کام کر چکا تھا۔

''میں باتھی سے ناراض نہیں ہوں۔'' سری داس نے کہا۔ یہ ایک غیر متوقع اعتراف تھا۔ ہم جب سے بیل گاڑی میں بیٹھے تھے وہ خاموش تھا اور یقیناً پرانی باتوں کے متعلق سوچتا رہا تھا۔

''میرا نہیں خیال تھا کہ تم باتھی سے ناراض ہو۔''

''اروندا، مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ تمہارے گھر میں ہوگی۔ میں اس سلسلے میں تھوڑا سا ناراض ہوا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں علم نہیں......''

یہ ایک پہیلی تھی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ جب سری داس نے باتھی کو وہاں دیکھا تو وہ ناراض ہوا تھا لیکن وہ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں علم نہیں......'' سے آگے کیا کہنا چاہتا تھا؟

''کیا تم باتھی کو میرے گھر دیکھ کر ناراض ہوئے تھے؟''

''میں تھوڑا سا پریشان ہوا تھا......''

''باتھی کے متعلق؟''

''نہیں، تمہارے متعلق۔''

سری داس صرف اس لیے مجھ سے ملنے آتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اب باتھی اور جینا داس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ راستے سے ہٹ چکے ہیں۔ انہیں میرے گھر دیکھنا ایک ناخوشگوار حیرت ثابت ہوئی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے کیوں ناراض تھا؟

''میرے متعلق پریشان ہوئے تھے؟''

بیل اب زیادہ بھاگ رہا تھا اور مجھے اس کے نعل دار سموں تلے کچی سڑک کی آواز آ رہی تھی۔ مجھے اس وقت تک احساس نہیں ہوا تھا کہ ہم پہلے ہی بڑی سڑک پر پہنچ چکے تھے اور اس پر کچھ فاصلہ بھی طے کر چکے تھے۔

''تو تمہیں کچھ نہیں پتا؟ تم نے کچھ سنا بھی نہیں؟''

وہ ابھی تک بجھارتوں میں بات کر رہا تھا۔ انسان بہت سی باتیں سنتا ہے۔ اس کی

مراد کن باتوں سے تھی؟

''مجھے کیا نہیں پتا؟'' میں نے قدرے بے ساختگی سے پوچھا۔

''جو باتیں لوگ کہتے ہیں......افواہیں......''

''میں یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ وہ کیا کہتے ہیں اور وہ اکثر میرے کانوں تک نہیں پہنچتیں۔ میرا کام دفتر میں ہوتا ہے۔ جب میں دفتر میں سارا دن گزارنے کے بعد گھر آتا ہوں تو پہلے کی نسبت بہت زیادہ تھکن محسوس کرتا ہوں، اور اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک بستر پر لیٹ کر اسے دور نہ کر لوں۔''

''اروندا، اگرچہ تم اپنے کام سے کام رکھتے ہو پھر بھی تم اس گاؤں میں تو رہتے ہو۔ تم لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کرنے یا ان سے بے خبر رہنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔'' اس نے تاکیداً کہا۔

''میں دفتر میں کام کرنے جاتا ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں گاؤں میں جاؤں۔ مجھے کیسے پتا چل سکتا ہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں؟''

''میں یہی تو کہہ رہا ہوں۔ جب تک تم یہاں رہتے ہو تمہیں پتا چلانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کیا ہو رہا ہے۔ تم آسمان سے تو نہیں اترے۔ لوگوں کے پاس کہنے کے لے شاذ و نادر ہی کوئی قابل ذکر بات ہوتی ہے، لیکن وہ ہر طرح کے سکینڈل مشہور کرتے رہتے ہیں اور کوئی بھی ان سے بچ نہیں سکتا۔''

سری داس یقیناً مجھے کسی ایسی افواہ کا اشارہ دینے کی کوشش کر رہا تھا جو گاؤں میں میرے اور باتھی کے متعلق پھیلی ہوئی تھی۔

''میں نے کچھ نہیں سنا، مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔''

میں نے اس سے بار بار سوال کیا لیکن اس سے کچھ نہ اگلوا سکا۔

بیل گاڑی سروجنی کے پرانے گھر کے سامنے صحن میں رک گئی۔ برآمدے میں لیمپ لٹکے ہوئے تھے اور خاصے لوگ موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں ایسے دیکھا جیسے کسی سوچ میں گم ہوں۔ وہ یقیناً مریض کے متعلق باتیں کر رہے ہوں گے۔ جب سری داس اور میں

بے برآمدے میں قدم رکھا تو سب لوگ خاموش ہو گئے۔ میرے لیے، جو خود اپنے ابا کی بیماری اور وفات دیکھ چکا تھا، موت کی بو سونگھ لینا مشکل نہیں تھا۔

سروجنی اور اس کی والدہ نے ، جو بیمار آدمی کے سرہانے بیٹھی تھیں، دو حیران ہرنوں کی طرح منہ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ کمرہ نیم روشن اور خاموش تھا۔ میں نے منڈلاتی ہوئی موت کی چاپ محسوس کر لی جو کسی چمگادڑ کے پھڑ پھڑاتے ہوئے پروں کی طرح سناٹے میں خلل ڈال رہی تھی۔

سروجنی کے حلیے نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ایک عورت جب کسی ایسے شخص کی تیمارداری کر رہی ہو جسے وہ چاہتی ہو تو اس کام میں پورے تن من سے محو ہو جاتی ہے۔ کسی اور کے لیے یہ دباؤ بنیادی طور پر جسمانی ہوتا ہے۔ سروجنی نے اپنے والد کی دیکھ بھال میں اپنی تمام ذہنی اور جسمانی قوتیں صرف کر دی تھیں اور ان کی حالت میں کسی قسم کی بہتری نہ ہونا اس کے جسم سے زیادہ اس کی روح کو تھکا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ تب تک اپنے والد کی خدمت کرتی رہے گی جب تک مکمل طور پر تباہ حال نہیں ہو جاتی۔ سری داس میں چیزوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہے۔ بعض اوقات میں اس سے بھی زیادہ مطمئن لگتا ہوں لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ کسی خدمت گار یا قابل اعتبار شخص کو ملازم رکھ کر سروجنی کا کام ہلکا کر سکتا تھا۔ وہ ایسا نہیں کر رہا تھا۔ میں جو سوچ رہا تھا میں نے سروجنی کو بتا دیا لیکن اس نے میری بات نہ سنی۔

''جب تم مجھ سے محبت کرتے تھے تو تب بھی چیزوں کو ایسے ہی دیکھتے تھے۔'' اس نے خفا ہو کر کہا۔

''میں یہ بات جذبات میں آ کر نہیں کر رہا۔ عقلمندی کا تقاضا یہی ہے۔ نہ تو سری داس اور نہ ہی تمہارے والد کو یہ حق ہے کہ تمہیں خود کو اس تباہ کرنے دیں۔''

''تم خاندانی رشتوں، محبت اور ایسی چیزوں کے متعلق نہیں جانتے۔'' اس نے حقارت سے کہا۔ ''جو کوئی بھی ایسی ذمہ داریوں کو ناپنے کے متعلق سوچتا ہے خود غرض ہوتا ہے۔ جب کچھ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو ایسے لوگ کسی نہ کسی طرح اس سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داریاں مکمل طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ذمہ داریاں

ادا کرنی چاہئیں، ان پر بحث نہیں کرنی چاہیے۔''

''سری داس ڈرتا ہے کہ تم بیمار ہو جاؤ گی......''

''کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ میں کتنی بیمار ہو جاتی ہوں؟ ابا کی حالت بہت خراب ہے۔ مجھے انہیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔''

طبیب کہہ چکا تھا کہ مریض ایک یا دو دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔

دوائیں ایسے مریض کو کس طرح بچا سکتی تھیں؟ میں نے مزید بحث نہیں کی۔

''اروندا، تمہارا دل بہت جلدی پگھل جاتا ہے۔'' اس نے قدرے غصے سے کہا۔

''لیکن تمہاری سوچ بہت مختلف ہے۔ باتھی کے معاملے میں بھی......؟''

اس نے فقرہ مکمل کرنے کی بجائے جلدی سے کہا: ''کیا تم نے اسے بتایا تھا کہ میں ابا کی بیماری کی وجہ سے اس سے ملنے نہیں آ سکی؟''

وہ یقیناً صورتحال کے مطابق بات کرنا جانتی تھی کیونکہ ابھی یہ الفاظ اس کے ہونٹوں پر ہی تھے کہ اس کے چہرے پر درشتگی کی جگہ ہمدردی نے لے لی۔ سری داس نے بھی اشاروں میں کوئی بات کی تھی، غالباً باتھی اور میرے متعلق کوئی افترا پردازنہ افواہ۔ سروجنی بھی یقیناً وہی بات اگلنے والی تھی جب اس نے بہت چالاکی سے اپنی بات بدل دی۔

بیسواں باب

مینکا میرے کردار کے کچھ پہلوؤں کو مجھ سے بھی بہتر سمجھتی تھی۔ ابھی میں بچہ ہی تھا تو مجھے غیر روایتی طریقوں سے سوچنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ میرا خیال ہے یہ کسی پیدائشی خصلت کا نہیں بلکہ مجھ پر ابا کے اثر کا نتیجہ تھا۔ اس سے مجھے وقتی خوشی ضرور ملتی تھی لیکن مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اپنے رسم و رواج سے متصادم خیالات کے مطابق عمل کر کے مجھے صرف تکلیف اور نقصان ہی پہنچتا ہے۔

لہٰذا جب عمل کرنے کا وقت آتا تو میں بیشتر ناکام ہو جاتا کیونکہ میں چیزوں کو رواج کے مطابق کرنے کی کوشش کرتا جبکہ حقیقت میں میں چیزوں کو خاصی مختلف طرح دیکھتا تھا۔ مینکا چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق کرنے میں اتنی ماہر اس لیے تھی کیونکہ وہ سوال جواب کیے بغیر اپنے جذبات کے مطابق عمل کرتی تھی۔ سروجنی نے کہا تھا کہ میں صرف اس لیے غیر رسمی طور پر سوچنا پسند کرتا ہوں کیونکہ میرا عمل کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا۔ اس کا الزام بے بنیاد نہیں تھا۔ خیالات میں نڈر اور عمل میں ریا کار ہونے کی وجہ سے میں منافق بن گیا تھا۔ ایسی منافقت غیر فطری ہو سکتی ہے لیکن معاشرہ اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ اتنا کائیاں ہونے سے بہتر ہے کہ کسی بن باسی کی طرح جنگل میں زندگی بسر کی جائے۔

اس سے پہلے کہ میں واپس گھر جانے کے لیے بیل گاڑی میں بیٹھتا سری داس نے مجھے باغ میں ایک درخت کے نیچے روک لیا تاکہ مجھ سے مریض اور سروجنی کے بارے

میں بات کر سکے۔ وہ وید جیا تلک کا فیصلہ تسلیم کر چکا تھا کہ سروجنی بیمار آدمی کے لیے مزید کچھ نہیں کر سکتی اور اب وہ اس بات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آیا مریض کسی خفیہ دوائیوں سے علاج کرنے والے طبیب کے علاج سے ٹھیک ہو سکتا ہے یا نہیں۔

''ہاں، مجھے یقین ہے کہ ایسی دوائیاں ہوتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کیا اس معاملے میں کچھ راز کی باتیں ہیں؟''

''لیکن کوئی ڈاکٹر پورے وثوق سے اس دن کی پیش گوئی نہیں کر سکتا جس دن مریض چل بسے گا۔ ایسے مریض بھی صحت یاب ہو چکے ہیں جن کا علاج یہ کہہ کر روک دیا گیا تھا کہ اب وہ ایک یا دو دن کے مہمان ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ خفیہ دوائیاں موجود ہیں جنہیں استعمال کیا جا سکتا ہے؟'' سری داس نے پوچھا۔

''یہ درست ہے کہ ڈاکٹر اس دن کی پیش گوئی نہیں کر سکتا جس دن مریض کا انتقال ہوگا اور یہ بھی سچ ہے کہ قریب المرگ مریض خفیہ دوائیوں سے ٹھیک ہو چکے ہیں لیکن یہ صرف تبھی ممکن ہے جب مریض کا دل اور دوسرے اعضاء صحیح حالت میں ہوں۔''

سری داس نے باتھی اور میرے بارے میں اڑنے والی افواہوں پر بات کرنے سے پہلے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اس نے صاف صاف تو نہیں کہا کہ عورتیں میری کمزوری ہیں لیکن کچھ ایسی باتیں کیں جن سے اندازہ ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔

سری داس کے لیے یہ گفتگو تکلیف دہ تھی اور اس نے سکینڈل بازوں کے بارے میں اپنی حقارت کا اظہار بھی کیا لیکن اس نے مجھے بھی قصوروار ٹھہرایا اور اتنا زیادہ کہ اس کے کچھ الزاموں پر مجھے غصہ آ گیا۔

''تم نے ایسے طریقے سے زندگی بسر کی ہے جس نے لوگوں کو تمہارے بارے میں کہانیاں بنانے کا موقع فراہم کیا ہے۔ گوناوتی نے جب تمہارے لیے کام کرنا شروع کیا تو وہ کسی بھی طرح بوڑھی عورت نہیں تھی۔ اور باتھی کو سکول بھیجنے کو تو چھوڑو لیکن تمہارے لیے اسے بھی ساتھ رکھنا کیا ضروری تھا؟ اگر تم نے اسے ان کے کسی رشتے دار کے پاس رہنے کے لیے بھیج دیا ہوتا تو کیا تم اسے پڑھا لکھا نہیں سکتے تھے؟ تم نے اپنی والدہ کو اپنے ساتھ رہنے کا کیوں نہیں کہا؟ خواہ وہ مانتیں یا نہ مانتیں اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ حقیقت یہ ہے

کہ تم نے ان کے متعلق بالکل بھی نہیں سوچا تھا۔''

جو باتیں لوگ میرے بارے میں کر رہے تھے مینکا ان کی وجہ سے حد درجہ ناراض تھی۔

''اس نے ایک عورت کو پکڑ لیا جو تمہارے اور باتھی اور اس کی ماں کے بارے میں افواہیں پھیلا رہی تھی اور اس کے خوب تھپڑ مارے۔'' سری داس نے مجھے بتایا۔

''باتھی کے جانے کے بعد وہ ضرور یہاں آئے گی اور تمہیں خوب ڈانٹے گی۔'' اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مینکا ان تہمتوں کو سچ سمجھتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

جو کچھ میں نے سری داس سے سنا اس نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ لوگ جب مجھے گلیوں میں دیکھتے ہوں گے تو یقیناً مجھ پر ہنستے ہوں گے اور مجھے بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا کہتے ہوں گے۔ میں نے باتھی کو سکول کیوں بھیجا؟ میں نے اس وقت کے متعلق نہیں سوچا تھا جب وہ جوان ہو جائے گی، جب اس کی میرے گھر میں موجودگی ہر قسم کی افواہوں کو جنم دے گی۔ جو کوئی بھی اس کے چہرے کو دیکھتا اسے یقیناً حیرت ہوتی ہوگی کہ میں اس کے ساتھ عملی طور پر اکیلا رہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے بھی اس کا چہرہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی لیکن میں نے جسمانی طور پر اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا۔

ہم جس درخت کے نیچے کھڑے تھے اس کے گھنے پتوں سے چھنتی ہوئی ہلکی چاندنی میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میری جلد گرم ہے اور میرے ماتھے اور کھوپڑی سے پسینہ بھی بہنے لگا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے ایک پیڑ کا سہارا لے لیا۔

''اروندا، تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔'' سری داس نے مجھے سنبھالتے ہوئے کہا۔

''یہاں کھڑے ہونا اور باتیں کرنا تمہاری برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔''

''ہاں، بہت کمزور۔'' میں نے کہا۔ لیکن یہ جسمانی کمزوری نہیں تھی۔ میں شدید ذہنی اذیت کی وجہ سے بیہوش ہو رہا تھا۔

لوگ میرے بارے میں کہتے تھے کہ اروندا نے پہلے گوناوتی کو بیوی بنا کر رکھا۔

جب اس کی بیٹی جوان ہوگئی تو اس نے اسے بھی اپنے بستر کی زینت بنا لیا۔ پھر اس نے پکڑے جانے کے خوف سے باتھی کی شادی جینا داس سے کردی۔ اس بدمعاش نے اسے پیسوں کی وجہ سے قبول کر لیا۔ اروندا نے دولہا کو گاڑی اور پانچ ہزار روپے دیے۔ اگر اس نے سیاہ کاریاں نہ کی ہوتیں تو کیا اس نے ملازمہ کی بیٹی پر اتنے پیسے خرچ کیے ہوتے؟ جینا داس یقیناً جانتا ہوگا کہ لڑکی مصیبت میں ہے اسی لیے اروندا نے اسے راضی کرنے کے لیے گاڑی کا تحفہ دیا ہوگا۔

دیہاتی اس قسم کی تہمت آمیز گفتگو اس لیے نہیں کرتے تھے کہ انہیں مجھ سے نفرت تھی یا وہ مجھ پر کیچڑ اچھالنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ افواہیں پھیلانا ان کا بنیادی مشغلہ تھا۔ زیادہ تر دیہاتی روزانہ اخبار نہیں خرید سکتے اور افواہیں، خواہ وہ کتنی بھی تہمت آمیز کیوں نہ ہوں، انہیں اس قسم کی تفریح مہیا کرتی ہیں جو لوگوں کو اخبار پڑھ کر ملتی ہے۔

اخباروں میں شادی شدہ اور طلاق یافتہ عورتوں کے ساتھ معاشقوں اور شادی شدہ مردوں کے اپنی ملازماؤں کے ساتھ جنسی تعلقات کی کہانیاں چھپتی ہیں۔ دیہاتی بھی ایسی ہی کہانیاں سنتے ہیں اور ان سے اتنا ہی محظوظ ہوتے ہیں جتنا ہمارے مقامی سکینڈلوں سے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اخباری خبریں ان سکینڈلوں کے بارے میں ہوتی ہیں جو واقعی ہوتے ہیں جبکہ وہ کہانیاں جو دیہاتوں میں دہرائی جاتی ہیں ہمیشہ سچی نہیں ہوتیں۔ لیکن جب دیہاتیوں نے ان کہانیوں کو پھیلایا تو وہ غالباً مجھے ذاتی طور پر تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ صرف گاؤں کے چند ''پڑھے لکھے'' لوگ ہی ایسا کرنا چاہتے ہوں گے جو گھونگھے کی طرح اپنے خول میں بند رہنے کی میری عادت پر برہم تھے۔

دیہاتی فطری طور پر کسی صورتحال کو اپنے تجربے اور جذبات کے حساب سے پرکھتے ہیں۔ وہ کسی نوجوان کی غلطیوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ بہرحال اگر کوئی لڑکی مصیبت میں پھنس جائے تو اس کی ساکھ ضرور خراب ہو جاتی ہے۔ باتھی محض ایک نوکرانی کی بیٹی تھی۔ اروندا نے یقیناً اس کی شادی کسی نوجوان سے کی ہوگی اور اسے جہیز بھی دیا ہوگا کیونکہ وہ اس نقصان کو پورا کرنا چاہتا ہوگا جو اس نے اسے پہنچایا تھا۔

درحقیقت دیہاتی معاشرے کے خود ساختہ لیڈر ہی اس قسم کی افواہیں پھیلاتے ہیں، دیہاتی ایسا نہیں کرتے۔ ان کہانیوں کو پھیلانے میں وہ یقیناً مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میرا تعلق بھی اوپری طبقے سے ہے۔

جو کچھ میں نے ابھی ابھی سنا تھا اس میں پوری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، پھر بھی میں خود کو دیہاتیوں کو برا بھلا کہہ کر یا ان کو حقارت کی نظر سے دیکھ کر اپنے احساسات کو سکون دینے پر راضی نہ کر سکا۔

میں اپنے مرحوم والد کو بالکل بھول چکا تھا۔ ہماری علیحدگی کے بعد اماں بھی شاذونادر ہی میری سوچوں کا محور ہوتیں۔ جب میں ان کے متعلق سوچتا بھی تو اس سے مجھے صرف غصہ آتا کیونکہ میں بیٹے کی حیثیت سے اپنے فرائض پورے کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اگرچہ میں ابھی تک مینکا کو خاصا چاہتا تھا لیکن اس کی کمینگی اور چالاکی نے میرے لیے اس کے ساتھ رہنا ناممکن بنا دیا تھا۔ میں سروجنی سے محبت کرتا تھا لیکن یہ جذبہ بھی بتدریج معدوم ہو گیا تھا۔ میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ محبت، چاہت، ہمدردی اور بھائی چارہ صرف قربت کے مختلف درجوں کے نام ہیں لیکن یہ میرے انتہائی اعلیٰ عقائد و نظریات کو ملیا میٹ کر رہے تھے۔ اگر میں ابا کی وفات کے صرف چند برس بعد انہیں بھول گیا تھا تو کیا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ محبت کئی برس اکٹھے رہنے کا ضمنی نتیجہ ہے؟ منطق اور تجربہ مجھے بتاتے تھے کہ ایسا ہی ہے لیکن میں نے پھر بھی خود کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ دائمی رشتے ہیں جو فطرت کے کسی پر اسرار قانون سے جنم لیتے ہیں۔

باتھی کے لیے میرے جذبات غیر محسوس طور پر کسی ایسی چیز میں تبدیل ہو گئے جو اس محبت جیسی تھی جو میں سروجنی کے لیے محسوس کرتا تھا۔ یہ محبت یقیناً اس لیے اس طریقے سے پروان چڑھی تھی کیونکہ میرے والدین، میری بہن اور سروجنی سب کے سب میری زندگی سے نکل چکے تھے۔ لیکن کوئی شخص لوگوں سے مکمل طور پر علیحدہ کسی طرح ہو سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ وہ جنگل میں کسی تارک الدنیا کی طرح رہنا شروع کر دے۔

اگر باتھی میرے گھر میں ہی رہتی تو ان افواہوں کی وجہ سے ہونے والی تکلیف جلد ہی غائب ہو گئی ہوتی۔ لیکن میری تنہائی میں یہ ایک زہر تھا جو مجھے بتدریج تباہ کر رہا تھا۔

سروجنی کے لیے میری محبت نے مجھے اپنی زندگی کے سب سے بڑے چوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ مجھ میں اتنی عقل نہیں تھی کہ اپنا راستہ چنتا اور بہادری سے قدم اٹھاتا۔ جب سروجنی نے سری داس سے شادی کر لی تو پھر بھی مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس راستے پر چل پڑوں جو میرے لیے باقی بچا تھا۔ کسی ویران جگہ پر اکیلے جانے کے لیے یا کسی خانقاہ میں داخل ہونے کے لیے یا خود کو خواہش سے پوری طرح نجات دلانے کے لیے جرات اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھ میں ان دونوں خوبیوں کا فقدان ہے۔

☆☆☆

میں دفتر میں حسب معمول کام کرتا رہا۔ بظاہر مجھ میں کسی چیز کے لیے سکت نہیں تھی۔ میں اپنے کیمیائی تجربوں میں دلچسپی کھو چکا تھا اور تانبے کو سونے میں بدلنے کی میری کوششیں بے ثمر رہی تھیں۔ مختلف قسم کے منتروں سے میری دلچسپی کم نہیں ہوئی تھی لیکن شدید جسمانی کمزوری نے مجھے اس تفریح سے بھی محروم رکھا۔

رفتہ رفتہ مجھے صبح کے وقت اٹھنا مشکل لگنے لگا۔ میرے جسم میں یوں درد ہوتا جیسے مجھے پیٹا گیا ہو۔ ذرا سی بھی جسمانی کوشش سے میں ہانپنے لگتا۔ مجھ میں کیا خرابی تھی؟

میں زیادہ عرصے کام سے دور نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا میں ایک سرکاری ڈاکٹر کے پاس گیا۔

''اروندا، تم اتنے کمزور ہو چکے ہو کہ تمہیں سرے سے دفتر ہی نہیں جانا چاہیے۔'' اس نے میرا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ اس نے دو اور ڈاکٹروں کو بلایا اور ان سب نے اتفاق کیا کہ کئی برسوں کی لاپرواہی کی وجہ سے مجھے اینمیا ہو گیا ہے۔ بڑے ڈاکٹر نے کہا کہ وہ یہ تجویز کرنے کے لیے میرے دفتر خط لکھے گا کہ مجھے چھ مہینے کی چھٹی دے دی جائے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے فوراً ہسپتال جانے کی ضرورت ہے۔ اگر میری حالت دو یا تین مہینوں میں بہتر نہ ہوئی تو شاید مجھے اپنی سرکاری نوکری سے ہی استعفیٰ دینا پڑے۔

ہسپتال جانے کی بجائے میں وید جیا تلک کے پاس چلا گیا۔ ان کی دواؤں سے بظاہر میری حالت اور بگڑی۔ اب میں اتنا کمزور ہو گیا کہ میرے لیے بستر سے نکلنا یا اپنے کمرے سے باہر جانا بھی مشکل ہو گیا۔ بستر پر لیٹے رہنے کی وجہ سے میں سست ہو گیا۔ بعض

اوقات جب میں بستر پر لیٹا اخبار پڑھ رہا ہوتا تو اس کا کچھ حصہ میرے نیچے آجاتا لیکن میں اپنے جسم کو حرکت نہ دے سکتا۔ حتیٰ کہ میں اخبار کو علیحدہ کر دیتا اور ایک ایک صفحہ کر کے پڑھتا۔ میں سوچتا کہ کیا مجھے واقعی اینمیا ہے یا صرف سستی اور مردہ دلی ہے۔

''تمہارے خون کا پتلا ہونا تمہیں سست بناتا ہے۔'' وید جی نے کہا۔''یہ یقیناً کئی برس پہلے شروع ہوا ہوگا۔ کسی ایسے شخص کا علاج کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جو اتنے لمبے عرصے سے تمہارے جیسی حالت میں ہو۔''

''آپ نے شروع میں تو یہ نہیں کہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ آپ کی دوا کی تین یا چار خوراکوں سے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

وہ طنزیہ مسکرائے۔

''مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ تم کتنے عرصے سے بیمار ہو۔ تمہارا معدہ تو اتنا بھی مضبوط نہیں ہے کہ کوئی فولادی شربت ہضم کر لے۔''

انہوں نے میری نبض دیکھی۔ کیا نبض یہ بتاتی ہے کہ کوئی کتنے عرصے سے بیمار ہے؟ اگر یوں ہے تو انہیں تب کیوں نہیں پتا چل گیا تھا جب انہوں نے پہلی مرتبہ میری نبض دیکھی تھی؟

''میں نے تمہاری نبض یہ پتا چلانے کے لیے دیکھی ہے کہ میری دوائیوں سے کوئی فرق پڑ رہا ہے یا نہیں۔'' انہوں نے کہا۔''اگر تم چاہو تو ہسپتال جا سکتے ہو۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے کہا۔

یہ دیہاتی طبیب مریض کو صرف تب ہسپتال بھیجتے ہیں جب وہ سمجھتے ہیں کہ وہ نا قابل علاج ہے۔

شروع میں نے انہوں نے یقیناً اچھی طرح آزمائے ہوئے نسخوں پر انحصار کیا ہوگا کیونکہ وہ بہت بڑے روایت پسند تھے۔ جب ان سے کام نے بنا تو وہ یقیناً ایسی دوائیوں پر آ گئے جو مختلف اعضاء کو مضبوط کرتی ہیں۔ گولیوں اور لیپ کی آخری کھیپ یقیناً اسی قسم کی کوئی چیز ہوگی۔

یوں لگتا کہ میرے کمرے حتیٰ کہ پورے گھر پر ناامیدی کا سایہ ہے۔ میں سارا

دن بغیر سوئے اور بغیر جاگے بستر پر لیٹا رہتا۔ سونے اور جاگنے کے درمیان اس دنیا میں کتے کو بھونکنا مجھے کسی شیر کی دھاڑ جیسا معلوم ہوتا۔ ہلکا سا درد بھی کئی گنا بڑھ جاتا اور میرے پورے جسم میں پھیل جاتا۔ میری الماری کے اوپر تھوڑا سا پلستر گرنے کی آواز کسی دھماکے جیسی سنائی دیتی۔ جب میں بستر پر جگہ تبدیل کرتا اور ایک لمحے کے لیے ارد گرد دیکھنے کے لیے آنکھیں کھولتا تو بہتر محسوس کرتا اور تکلیف غائب ہو جاتی۔

میری بیماری کے ابتدائی دنوں میں بستر پر بے حس و حرکت لیٹے ہوئے میرے ذہن نے ماضی کا جائزہ لیا۔ اب یوں لگتا تھا کہ میرا ذہن بھی میرے جسم جتنا بے حرکت ہو گیا ہے۔

باتھی کی ماں نے بغیر بڑبڑائے میری تیمارداری کی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا بستر ہر روز تھوڑا تھوڑا کر کے کسی کھائی کی گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے۔ اگر میں صاحب فراش ہو جاؤں تو کیسا رہے گا؟

مینکا ہر روز مجھے دیکھنے آتی تھی۔ اس نے مجھے اس بات پر آمادہ کرنے کی پوری کوشش کی کہ میں اس کے گھر منتقل ہو جاؤں۔ ''اروندا، میرے گھر واپس آ جاؤ۔ یہاں تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا؟'' یہ غالباً چوتھی بار تھی جب اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ میری حالت یقیناً قابل رحم تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''دیدی، میں ایسا چاہتا ہی نہیں۔ مجھے تیمارداری کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اس قسم کی بیماری نہیں ہے۔ میں اس لیے بستر پر پڑا رہتا ہوں کیونکہ میں خاصا بے جان محسوس کرتا ہوں۔''

''اگر تم نے اس عورت کے پکائے ہوئے چاولوں اور سبزیوں کے علاوہ کچھ نہ کھایا تو تمہاری طاقت بحال نہیں ہوگی۔ یہ گھر چھوڑ دو اور ہمارے ساتھ رہو۔ اس عورت سے کہو کہ جائے اور اپنی بیٹی کے ساتھ رہے۔ اس طرح تم اپنے خاندان کی ساکھ خراب کر دو گے، حتیٰ کہ ابا کا نام بھی مٹی میں مل جائے گا۔ یہ عورت بہت مکار ہے۔ ایسے لوگ تمہاری طرح نہیں سوچتے۔ انہیں اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اس سے انہیں تکلیف نہیں پہنچے گی۔ یہ صرف اپنا فائدہ دیکھ رہے ہیں۔ آخر کار اس نے اپنی بیٹی

کی شادی بھی کروا ہی دی۔ تم نے ان پر یقیناً کم از کم بیس تیس ہزار روپے تو خرچ ہوں گے۔''

''جوتم کہہ رہی ہو وہ غلط نہیں ہے لیکن میں تمہاری طرح نہیں سوچتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میرے لیے کام کرتے رہنے میں اس عورت کا کوئی ذاتی فائدہ ہے ۔ ہم سب اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں پر میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بہت محنت کرتی ہے۔ میں اسے زیادہ پیسے نہیں دیتا۔ جب میں نے اس کی بیٹی کو سکول بھیجا تو یہ بات میرے مدنظر تھی۔ یقیناً بہت سی ایسی عورتیں ہیں جو بہت معمولی معاوضے پر کام کرنے کو تیار ہوجاتی ہیں۔ غالباً تم سمجھتی ہو کہ جب ہم انہیں بدلے میں کھانا اور کپڑے دیتے ہیں تو یہ کافی ہوتا ہے۔ میرا نقطہ نظر تم سے مختلف ہے۔ میں نے اس کی بیٹی کو سکول اس لیے بھیجا کیونکہ میرا خیال تھا کہ یہ میرا فرض ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اس پر ترس آتا تھا اور میں سخی بننا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی حرکتوں میں چھپے ہوئے مقاصد ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتی۔ تم صرف یہ جگہ چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔''

''اور کچھ نہ کہو۔'' میں نے چڑ چڑے پن سے کہا۔ ''میں نہیں چلوں گا۔''

''اپنے ساتھ ویسا ہی کرو جیسی تمہاری مرضی ہے۔ میں تمہارے ساتھ اور سر کھپائی نہیں کروں گی۔'' اس نے مجھے ڈانٹ پلانے والے انداز میں کہا۔

وہ دوبارہ کبھی نہ آئی۔ بہر حال ایک دن سروجنی آئی۔ یقیناً مینکا نے اسے میرے متعلق بتایا ہوگا۔

''مجھے پتا نہیں تھا کہ تم اتنے بیمار ہو۔'' اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ وہ خاصی پریشان تھی۔

وہ میری میز کے پاس پڑی کرسی کھینچ کر میرے بستر کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک ان کوششوں کے نشان باقی تھے جو اس نے اپنے والد کی تیمارداری کرتے ہوئے کی تھیں، لیکن اپنے سفید ماتمی لباس میں وہ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔

میرے ذہن نے ماضی کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن ماضی میری گرفت سے باہر دکھائی دیا۔

''کیا وید جیا تلک کی دوائیوں سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو رہا؟'' اس نے پوچھا۔

''زیادہ نہیں۔'' میں نے اپنی آنکھیں اس سے پرے رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بہت عرصے سے سری داس کو نہیں دیکھا۔''

''وہ اب پہلے سے بہت زیادہ مصروف ہو گیا ہے۔ اسے جائیداد کی دیکھ بھال بھی کرنا پڑتی ہے اور پھر ابا کی وفات کے بعد اماں گھر پر اکیلی ہوتی ہیں۔ سری داس کو وہاں بھی چیزوں کا دھیان رکھنا ہوتا ہے۔ اس کی والدہ ہم سے قدرے ناراض ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہمیں ابا کی تیمارداری کے لیے اس طرح اپنا گھر نہیں چھوڑ دینا چاہیے تھا۔''

''میں جانتا ہوں۔ جلد یا بدیر وہ یہ بھول جائیں گی۔''

''کیا سری داس نے تمہیں اس کے متعلق بتایا تھا؟'' اس نے سیدھا میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہاں تمہاری دیکھ بھال کے لیے کوئی موجود ہے؟ تمہیں اپنی بہن کے گھر چلے جانا چاہیے۔''

یہ خیال اسے خود بخود نہیں آسکتا تھا۔ وہ یقیناً مینکا کی باتیں دہرا رہی تھی۔ مینکا کو دھرم داس کے علاوہ دو بچوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔

''کیا تم نہیں سمجھتیں کہ میں اس کے لیے مصیبت بن جاؤں گا؟''

سروجنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کسی چیز نے مجھے اس کے آخری خط کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خط ابھی تک میرے پاس تھا۔ اگر میں نے ویسا ہی کیا ہوتا جیسا وہ چاہتی تھی تو وہ اب میرے ساتھ ہوتی، وہ میری دیکھ بھال کر رہی ہوتی۔ اپنے ماضی کے متعلق سوچتے ہوئے میرے ذہن نے نتیجے سے بے پرواہ ہو کر جدوجہد کی، جیسے کوئی بیمار آدمی بادلوں میں چھپی ہوئی چوٹی کو سر کرنے کی کوشش کرے۔ جیسے جیسے میں نے ماضی کو تسخیر کرنے کی کوشش کی میرے اندر عجیب وغریب احساسات اور خواہشات کھلبلی مچانے لگیں۔

ایک ایسا مریض جسے کئی دنوں سے چاولوں کا دلیا کھانا پڑ رہا ہو چاول کھانے کے لیے ترسنے لگتا ہے۔ وہ بہت جانے پہچانے کھانوں میں غیر معمولی ذائقوں کا تصور کرنے لگتا ہے۔ جب میں نے اس کے لیے اپنے جذبات اور اس کی محبت کو یاد کیا تو تکلیف اور خوشی

دونوں کے احساسات میرے اندر پھوٹ پڑے۔ میں اس گھر میں تنہا رہنے کے لیے آیا تھا۔ میں باتھی کو پال پوس کر خود ہی تنہائی کا شکار ہوا تھا۔ میں دیہاتیوں کی تہمت آمیز افواہوں کا نشانہ بنا تھا۔ یہ سب اس لیے ہوا تھا کہ میرے اندر اس طرح عمل کرنے کے مشورے پر اس وقت عمل کیا جب میں اسے کھو چکا تھا! اس نے کہا تھا کہ اگر ہم کہیں چھوٹا سا گھر لے لیں تو ہم گزارہ کر لیں گے۔ لیکن میں نے یہ چھوٹا سا گھر اس لیے لیا تھا اور گوناوتی کو اس لیے ملازم رکھا تھا کیونکہ مینکا مجھے ناپسند کرنے لگی تھی۔ سروجنی کی شبیہہ بتدریج میرے ذہن سے مٹ گئی تھی اور باتھی نے غیر محسوس طور پر اس کی جگہ لے لی تھی۔

جب سروجنی نے وہ آخری خط لکھا تو اس نے یقیناً اس زندگی کے متعلق سوچا ہوگا جو ہم میاں بیوی کی حیثیت سے کسی ایسے گھر میں گزارتے جسے ہم اپنا کہہ سکتے۔ اس کے علاوہ اس نے اس خوشی کا تصور بھی کیا ہوگا جو ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھ کر مل سکتی تھی۔ لیکن مجھ میں اتنی اہلیت نہیں تھی کہ میں سروجنی کے لیے اپنے رومانوی جذبات سے آگے دیکھ سکوں۔ حتیٰ کہ جب مینکا نے بھی میری حوصلہ افزائی کی تو اس نے مستقبل کو بھانپ لیا تھا۔ میں کسی ایسے راہب سے بہتر نہیں رہا تھا جس کی فکر اس کی ناک سے آگے نہ جا سکے۔ میں اس مستقبل کو نہیں دیکھ سکا تھا جو انہیں نظر آتا تھا۔

میں نے اپنا پسینے سے گیلا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ کے اوپر رکھ دیا۔ میری انگلیاں آہستہ آہستہ بند ہوئیں اور انھوں نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ میری آنکھوں میں خوشی اور غم کے ملے جلے آنسو آ گئے۔

سروجنی نے اپنی آنکھیں زمین پر گاڑے رکھیں اور بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ میں نے جو ہاتھ تھاما ہوا تھا وہ ساکت اور بے جان تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے اس کے ہاتھ میں زندگی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی اور اس کی گرمی لوٹ آئی۔ اس نے میری طرف دیکھنے کے لیے آہستگی سے اپنا سر اٹھایا اور اس کا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ کے ساتھ مل گیا۔ جب اس نے دوبارہ نیچے دیکھا تو میرے خیال میں وہ اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا تم ان باتوں کو سچ سمجھتی ہو جو لوگ کہتے ہیں؟'' میں نے تکلیف دہ انداز

میں پوچھا۔اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''باتھی کے متعلق؟''

''باتھی کے متعلق؟ میرے اور باتھی کے متعلق۔'' میں نے اس کی مدد کرنے کے لیے کہا۔

وہ مسکرائی۔

''نہیں۔تم کسی عورت سے ایسے محبت نہیں کر سکتے۔تم ایک فاصلے سے محبت کرتے ہو۔''

''یہ پوری طرح درست نہیں ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم اس سے محبت کرتے تھے؟''

میری آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور مجھے یوں لگا کہ اس کے تجسس کے پیچھے نفرت چھپی ہوئی ہے۔

''میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس سے محبت تھی، لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔''

اس کے چہرے کے تاثر تھوڑا سا بدل گیا۔اس سے پہلے کہ میں اپنا جملہ مکمل کرتا اس نے کہا:

''اسی لیے تو میں نے کہا تھا تم ایک فاصلے سے محبت کرتے ہو۔''

''جب مجھے پتا چلا کہ باتھی ایک نوجوان کو خط لکھتی رہی ہے اور رات کو اس سے ملتی بھی ہے تو میں نے حسد محسوس کیا اور ناراض ہوا۔ بعد ازاں مجھے صرف مایوسی ہوئی اور پھر میرے حسد اور ناراضگی کی جگہ ہمدردی نے لے لی۔اگر مجھے اس سے محبت نہ ہوتی تو کیا مجھے حسد ہوتا؟''

''غالباً تم صرف اس لیے ناراض تھے کہ باتھی رات کے وقت جینا داس کو اپنی کھڑکی پر بلاتی ہے۔''

''میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کسی نوجوان لڑکے کو کسی نوجوان لڑکی سے بات نہیں کرنی چاہیے یا اسے کسی نوجوان لڑکے سے محبت نہیں کرنی چاہیے۔''

''ہوسکتا ہے یہ درست ہو لیکن بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کے دماغ میں ایسے خیالات آسکتے ہیں۔ کوئی ایسی چیز جسے آپ ہمیشہ بے ضرر سمجھتے رہے ہوں جب آپ اسے اپنی آنکھوں سے ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہوں تو وہ خاصی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی باپ یہ سنے کہ اس کی بیٹی رات کے وقت کھڑکی پر کسی نوجوان کے ساتھ باتیں کرتی دیکھی گئی ہے تو وہ بھی بہت ناراض ہوگا۔''

''باتھی میری بیٹی نہیں ہے۔ میں نے حسد محسوس کیا، غصہ نہیں۔''

''تو کیا تم اس سے واقعی محبت کرتے تھے؟'' اس نے بے ڈھنگے پن سے پوچھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے ''تو کیا تم اس سے واقعی محبت کرتے تھے؟'' اس لیے کہا کیونکہ وہ اپنے آپ کو یہ کہنے پر آمادہ نہ کرسکی کہ ''کیا وہ تمہاری داشتہ تھی؟''

''مجھے یقین نہیں کہ جب تم لفظ محبت استعمال کرتی ہو تو تمہارا مطلب کیا ہوتا ہے۔ میں زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہوں گا۔ اگر میں تمہیں کچھ چھپائے بغیر سب کچھ بتا سکوں تو میرا ذہن پرسکون ہو جائے گا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ تم کسی اور کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتی ہو۔''

''مجھ میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ تمہارے تمام خیالات کو واضح طور پر سمجھ سکوں لیکن تم جو بھی کہو گے میں اسے مان لوں گی۔ میں تم پر اعتماد کرسکتی ہوں۔ میں تمہارے متعلق کسی اور سے زیادہ جانتی ہوں۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''میرا خیال ہے تم صحیح تھیں۔ میں باتھی سے محبت کرتا تھا لیکن ایک فاصلے سے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ ایسی محبت بھی خطرناک ہوتی ہے۔ مجھے افسوس ہونا شروع ہوگیا کہ میں نے اسے اپنے ساتھ رکھا اور سکول بھیجا۔ سری داس اور مینکا دونوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں باتھی کو کہیں اور بھیج کر اس کی تعلیم کا بندوبست کیوں نہ کرسکا۔ مینکا کی عادت ہے کہ وہ ہر چیز کا، خواہ وہ کتنی بھی معصوم کیوں نہ نظر آئے، منفی پہلو دیکھتی ہے۔''

اس نے کچھ نہ کہا اور ساکت بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں دوسری طرف تھیں۔ بولنے نے مجھے تھکا دیا تھا۔ مجھے اپنا سانس بحال کرنے کے لیے رکنا پڑا۔

''میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں تمہاری ساری باتیں سمجھ رہی ہوں لیکن زیادہ تر لوگ چیزوں کو تمہاری طرح نہیں دیکھتے۔تم انہیں نہیں بدل سکتے۔'' اس نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اپنے بارے میں مشہور کہانیاں سنیں تو مجھے برا محسوس ہوا۔لیکن اب مجھے پرواہ نہیں ہے کہ وہ میرے متعلق کیا سوچتے ہیں۔ سروجنی، تم تو ایسی باتوں کو سچ نہیں سمجھتیں نا؟''

''نہیں، میں ان باتوں کو سچ نہیں سمجھتی......تمہاری دیکھ بھال کے لیے یہاں کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔''

اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا لیکن اس نے اس ہاتھ کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی جسے میں نے تھاما ہوا تھا۔

''مہربانی کرو اور مینکا کے گھر چلے جاؤ......اس کے ساتھ رہو۔ میں تمہاری دیکھ بھال میں مدد کرنے کے لیے کسی کو وہاں بھیج سکتی ہوں۔ مینکا اس بات کا خیال رکھے گی کہ وہ تمہارے لیے سب کچھ کرے۔ بیشک اس کے پاس کرنے کے لیے ہزاروں کام ہوں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی اس بات کا دھیان رکھنے سے نہیں چوکے گی کہ تم ٹھیک ٹھاک رہو۔''

میں صاف صاف انکار کر کے اسے تکلیف نہیں پہچانا چاہتا تھا۔

''میں اس کے متعلق سوچوں گا۔شاید میں مینکا کے گھر چلا جاؤں۔''

سروجنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں نے تمہارے باقی سارے خط جلا دیے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے اسے بھی کیوں نہیں جلا دیا۔'' میں نے وہ خط اسے دیتے ہوئے کہا۔

''ایسے موقعے بھی آئے ہیں جب میں نے اس خط کو دوبارہ پڑھ کر بہت خوشی محسوس کی ہے۔لیکن بعض اوقات مجھے ندامت بھی محسوس ہوتی ہے۔جیسے میں اپنے والد کو بھول گیا بالکل اسی طرح تمہارے لیے میری محبت پھیکی پڑ گئی۔لیکن میں کبھی اس خط کو نہیں بھولا۔''

اس نے خط کو کھولا اور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے آہ بھری۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ میری تنہائی اس کے لیے رنج کا باعث تھی یا وہ اس محبت کے بارے میں سوچ رہی تھی جو وہ کبھی میرے لیے محسوس کرتی تھی؟ غالباً اس نے سوچا کہ میں اس کے آنسو نہ دیکھ سکوں اس لیے اس نے کھڑکی کی طرف منہ کر لیا اور باہر باغ میں لگے ہوئے کیلے کے جھنڈ کی طرف دیکھنے لگی۔ رات ہونے والی تھی اور یوں لگتا تھا کہ درخت اور آسمان جھٹ پٹے میں غور وفکر کر رہے ہیں۔ ہوا رکی ہوئی تھی اور درخت کسی پتھر کی مانند ساکت تھے۔ ہر طرف پھیلے ہوئے گہرے سناٹے نے میرے تنہائی کے احساس میں اضافہ کر دیا۔ میں نے اپنی خواہشات کو دبانے اور کسی کو ناخوش کیے بغیر زندگی بسر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن دیہاتیوں نے مجھے منافق قرار دے دیا تھا۔ سروجنی کے جانے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرا گھر تباہ ہونے سے پہلے ہی ویران ہو چکا ہے۔

میری زندگی دھند لکے والے آسمان کی طرح ایک اداس صحرا بن گئی تھی۔ میں اس پچھتاوے پر شرمندہ تھا جس کے ساتھ میں نے ماضی کے متعلق سوچا تھا۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ میری تیمارداری کون کرتا ہے کیونکہ میں کبھی صحت یاب نہیں ہوسکتا۔ سروجنی اپنے والد کی تیمارداری کے لیے پورے تین ہفتے ہر رات جاگی تھی لیکن پھر بھی ان کا انتقال ہو گیا۔

☆☆☆

باتھی نے سنا کہ میں بیمار ہوں تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ مجھے دیکھنے آئی۔ جب اسے پتا چلا کہ میں کتنا بیمار اور بے توجہی کا شکار ہوں تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ اس نے اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہیں گے فوراً مجھے اپنے گھر منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شروع میں میں نے پس وپیش سے کام لیا لیکن زیادہ دیر تک انکار نہ کر سکا۔ میرا دل ہر طرف سے بھر چکا تھا۔ باتھی اور سروجنی ہی وہ لوگ تھے جن کے لیے میں چاہت جیسی کوئی چیز محسوس کرتا تھا۔

میری حالت زار نے سروجنی کو افسردہ اور رنجیدہ کر دیا تھا۔ میں اس سے ملنا اور باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ وہ مجھ پر اس لیے رحم کھا رہی ہے کہ میری مکمل بے بسی نے اسے متاثر کیا ہے۔ لہٰذا میں نے اس سے دوبارہ نہ ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر

اور اسے اپنی تکلیفوں کے متعلق بتا کر مجھے وقتی طور پر خوشی محسوس ہوئی تھی لیکن اس کے جانے کے بعد مجھے خود سے شرم آنے لگی تھی۔ یہ اس کی غلطی نہیں تھی کہ وہ سری داس کی بیوی بن گئی تھی، غلطی میری تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ اسے اپنے پچھتاوؤں کہ متعلق بتا کر میں نے اپنے بھولے پن کا ثبوت دیا ہے۔ اس کو پرانے جذبات کے متعلق پتا چلنے دینا انتہائی بچگانہ حرکت تھی۔

اگرچہ باتھی نے پوری طرح مایوس کیا تھا کہ لیکن اس کے لیے میری محبت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں بعض اوقات یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ اگر وہ میرے گھر میں رہ رہی ہوتی تو یہ میرے لیے خوشی کا باعث ہوتا۔ میں نے اسے اور جینا داس کو اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش صرف اس لیے نہیں کی تھی کیونکہ میں ان الزامات اور تہمتوں سے ڈرتا تھا جو میرے اپنے رشتے دار اور دیہاتی مجھ پر لگاتے۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہی میری تیمارداری کرے۔ میں نے صرف اس لیے تکلیفیں جھیلی تھیں کہ صرف اپنے متعلق سوچنے کی بجائے میں نے باتھی اور جینا داس کے ساتھ بھلائی کی تھی۔ اگر میں بے رحم ہوتا تو شاید مجھے اتنی بے بسی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ میں جینا داس سے چھٹکارہ حاصل کرکے باتھی کو اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔

اگرچہ جینا داس مجھے سارا راستہ سہارا دیتا رہا لیکن میں اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ میرے لیے کار تک چل کر جانا بھی تقریباً ناممکن تھا۔ جینا داس نے مجھے اٹھا کر لے جانے کو کہا۔ شروع میں تو میں اس پر راضی نہ ہوا لیکن میں اتنا ناتواں تھا اور وہ اتنے مصر تھے کہ مجھے ان کی بات ماننا پڑی۔ وہ خاصا طاقتور تھا۔ اس نے مجھے کسی بیمار بچے کی طرح اٹھایا اور کار میں رکھ دیا۔ باتھی میرے ساتھ بیٹھی اور میرے نیچے تین نئے غلافوں والے تکیے رکھ کر مجھے سہارا دیا تا کہ میں کار کے دھکے لگنے سے گر نہ جاؤں۔

☆☆☆

باتھی ایسی چاہت اور خلوص سے میری تیمارداری کرتی ہے جو میں نے ابا کی تیمارداری کرتی ہوئی مینکا میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر کسی نے مجھے پہلے کہا ہوتا کہ باتھی (جو

میری بیٹی، بیوی یا بہن نہیں ہے) میرے لیے اتنی چاہت اور ہمدردی کا مظاہرہ کرے گی تو مجھے خاصا تعجب ہوا ہوتا۔

ایک چھوٹی لڑکی گھر کے کام کاج میں مدد کرتی ہے۔ باتھی اپنا زیادہ وقت میری دیکھ بھال اور مجھے آرام پہنچانے کی کوشش کرنے میں گزارتی ہے۔ رات کے وقت باتھی اور لڑکی میرے کمرے کے ایک کونے میں گدوں پر سوتے ہیں۔ وہ مجھے میری دوائیں دینے کے لیے ہر رات دو مرتبہ جاگتی ہے۔ اگرچہ وہ دونوں وقت کا کھانا پکانے کے لیے روزانہ باورچی خانے میں جاتی ہے لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اس بات کو یقینی بنا لیتی ہے کہ وہ میرے علاج سے متعلق ہر چھوٹا بڑا کام خود کرے۔

جینا داس ایک ایسے طبیب کو بلا لایا جو پیچیدہ بیماریوں کے مریضوں کو ٹھیک کرنے کے لیے مشہور ہے اور اب میں اس کے زیرِ علاج ہوں۔ جینا داس کے تین دوست اکثر اس سے ملنے آتے ہیں۔ وہ باتھی کے ہر حکم کی تعمیل غلاموں کی طرح کرتے ہیں۔ انہیں میری دوائیوں میں پڑنے والی ایک ایک چیز لے کر آنی پڑتی ہے۔

بعض اوقات میں اسے اپنے لیے اتنا کچھ کرنے کی اجازت دینے پر شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔

''تمہارے لیے تو یہ ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ تم اس طرح میری خدمت کیسے کرتی رہو گی؟'' میں اکثر اس سے پوچھتا۔

''خدمت؟ آپ اسے خدمت کہتے ہیں!'' وہ زندہ دلی سے کہتی ہے۔ وہ اب مجھے مزید ''ابا'' یا ''صاحب'' نہیں کہتی۔

تقریباً ایک مہینے بعد باتھی کی ماں میرے گھر کو تالا لگا کر باتھی کے گھر منتقل ہوگئی۔ وہ بھی اب تقریباً اپاہج ہو چکی ہے کیونکہ وہ خاصی عمر رسیدہ ہے اور عمر جان توڑ کام کر کے تھک چکی ہے۔ میرے مقابلے میں باتھی اس کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتی۔ باتھی خود اپنی ماں کے لیے محبت اور رحم کیوں نہیں محسوس کرتی؟ باتھی شاید ہی کبھی اس سے تمیز سے بات کرتی ہو۔ بعض اوقات وہ واضح طور پر اس کی وجہ سے غصے میں آجاتی ہے۔ مجھے یقین

ہے کہ باتھی اپنی ماں سے تھوڑی بہت محبت ضرور کرتی ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ وہ محبت اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی ہے اور عام زندگی میں کبھی ظاہر نہیں ہوتی۔ درحقیقت ان کا تعلق بالکل ویسا ہی ہے جیسا تب تھا جب وہ دونوں میرے گھر میں رہتی تھیں۔ آٹھ برس کی عمر تک باتھی کی پرورش اس کی ماں نے کی تھی۔ یقیناً گوناوتی کے لیے اس کے کچھ فطری اور جبلی جذبات ہوں گے۔ جب وہ میرے گھر میں رہنے کے لیے آئیں تو ان کے تعلق نے ایک اور روپ دھار لیا۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے تب جو رویے اور عادتیں اپنائیں وہ ابھی تک ان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

☆☆☆

اب میں دیکھ سکتا ہوں کہ انسانی طور طریقوں کو جانچنے کی جرات کرنے سے پہلے کسی شخص کو بہت تجربہ کار ہونا چاہیے۔ اگر اس وقت میرے پاس زندگی کے بارے میں اپنی موجودہ معلومات کا صرف ایک چوتھائی بھی ہوتا جب میں ابھی کالج میں تھا تو میری زندگی یقیناً کسی اور ڈگر پر چل نکلی ہوتی۔

اپنی کھڑکی کی سلاخوں میں سے ایک اجاڑ کھیت کو دیکھتا ہوں جو بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سے آگے ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس کی چوٹیاں بظاہر سب سے اونچی نظر آنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ دور ترین چوٹیوں کے خاکے جو آسمان کو چھو اور اس میں گڈمڈ ہو رہے ہیں بادلوں کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔ بہر حال طلوع آفتاب کے وقت یہ خلاف عادت واضح اور ٹھوس ہوتے ہیں۔ پہاڑی سلسلے کی چوٹیاں بادلوں سے الجھی ہوتی ہیں لیکن اس کی بنیاد قابل کاشت زمین میں مضبوطی سے قائم ہوتی ہے۔

میرا ذہن کسی ٹوٹے ہوئے پروں والی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑاتا ہے۔

جب میں اپنے گھر میں رہتا تھا تو سارا کام گوناوتی کرتی تھی۔ وہ اپنا کام کسی کٹھ پتلی کی طرح کرتی تھی۔ بستر پر لیٹے ہوئے میرا ذہن بھی ہر آوارہ گرد سوچ سے کسی کٹھ پتلی کی مانند اچھلتا ہے۔

بعض اوقات میں باتھی اور سروجنی کے لیے اپنی محبت کو کسی مرتے ہوئے پرندے کے پروں کی طرح پھڑ پھڑاتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔

جن خواہشات سے میں نے خود کو محروم رکھا تھا اب میرے لیے غم کا نہیں بلکہ خوشی کا باعث ہیں۔

میری بیماری کے لمبے اور تنہا مہینے، جن کے دوران میری ضروریات کا خیال رکھنے کے لیے صرف گوناوتی تھی، یہ اس زندگی کی طرح تھے جو کسی سنگدل صحرا میں بسر کی جارہی ہو اور جہاں میں نے زندہ رہنے پر اپنا سارا اعتماد کھو دیا۔

اب میں جانتا ہوں کہ میری بیماری جان لیوا ثابت ہوگی لیکن مایوسی، محرومی اور بے حاصلی کے احساس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے کیونکہ یہاں پر شفقت، محبت اور چاہت قابل محسوس انسانی خوبیاں ہیں۔

جو تکلیفیں میں نے جھیلیں ان میں سے بیشتر کی وجہ باتھی تھی اور اب باتھی ہی نے مجھے سکون بخشا ہے۔

انسانی زندگی کو پرکھنے کے لیے ہم کوئی ایسا غیر مبدل پیمانہ نہیں ڈھونڈ سکتے جو روایت اور رسم و رواج کی وضع کردہ قدروں میں وقت، جگہ اور حالات کی تبدیلیوں سے آزاد ہو۔